خلا اندر خلا

محمد منشا یاد



خلا اندر خلا

(افسانے)

محمد منشا یاد

بوکا

تپش اگلتی زمین' مضبوطی سے گڑے ہوئے حبس کے خیمے' شکر دوپہر رات' ہر طرف گہرا ہولناک سناٹا۔رات کا کوئی پا بہ زنجیر لمحہ۔
گھمس گھمس گھمس ۔۔۔۔۔۔۔ پیاس پیاس پیاس!

عجیب خوفناک رات ہے جس کی بھی آنکھ تھوڑی دیر کے لئے لگتی ہے وہ ایک ہی جیسا ڈراؤنا خواب دیکھ کر ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تاریک اور گہرا کنواں ہے۔جس کے ارد گرد بہت سے لوگ جن کی صورتیں دھند اور تاریکی میں پہچانی نہیں جارہی ہیں' کھڑے ہیں۔وہ باری باری کنوئیں کے اندر جھانکتے اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔اپنی باری آنے پر ۔۔۔۔۔۔۔ میں اندر جھانکتا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ اندر ۔۔۔۔۔۔۔ باہر سے زیادہ تاریکی اور خاموشی ہے۔ مجھے پانی دکھائی نہیں دیتا مگر اس کے خیال سے میری پیاس اور بھڑک جاتی ہے میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں اور اپنے پیاسے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا ہوں۔ان میں سے ایک بار بار کھنکارتا' تھوک سے گلا تر کرتا اور کہتا ہے۔

''کچھ کرو ۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ سب پیاس سے مر جائیں گے۔''

''کیا کریں؟''

''ایک بار کنڈا ڈال کر دیکھو' شاید مل ہی جائے۔''

''نہیں ملے گا ۔۔۔۔۔۔۔ ہم کنڈے ڈال ڈال کر تھک گئے ہیں۔''

''کسی غوطہ خور کو بلواؤ۔''

''بلوایا تھا۔''

''پھر؟''

''اس نے کہا تہہ میں کیچڑ اور دلدل ہے اسے ڈر لگتا ہے۔''

''پھر کیا کریں؟''

''کوئی ہمت کرے اور جا کر نکال لائے۔''

''نہیں۔۔۔۔۔۔پہلے یہ پتہ چلاؤ یہ بار بار چھینک کون دیتا ہے؟''

''یہ بعد میں پتہ چلائیں گے۔''

''ہاں ہاں پہلے نکالنے تو دو۔''

''کچھ فائدہ نہیں۔۔۔۔۔۔پہلے یہ پتہ چلانا چاہیے کہ بار بار چھینک کون دیتا ہے؟''

''چپ کراوئے۔۔۔۔۔۔پہلے نکالنے تو دے۔''

''ہاں پہلے نکال کر پیاس بجھانی چاہیے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔''

''کوئی ہے جو اترے؟''

''کوئی ہے''

''کوئی ہے؟''

''کوئی نہیں۔۔۔۔۔۔ہم سب پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔''

''میں ہوں۔'' ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

''تم؟''

''ہاں میں۔۔۔۔۔۔میں جاؤں گا اور نکال کر لاؤں گا۔''

میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن آواز میرے حلق میں پھنس جاتی ہے۔ وہ کنوئیں کی منڈیر سے رسی باندھتا اور مضبوطی سے گرہ لگاتا ہے۔ سب حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھتے ہیں وہ رسی ہاتھ میں لے کر کنویں میں اترتا ہے میں تھوک نگل کر گلا تر کرتا ہوں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہتا ہوں۔

''یہ کیا کر رہے ہو ابا؟''

وہ کہتا ہے۔۔۔۔۔۔''مجھ سے لوگوں کی پیاس نہیں دیکھی جاتی' میں نکال کر لاؤں گا۔''

''بوکا نہیں ملے گا ابا۔۔۔۔۔۔تم خود کھو جاؤ گے۔''

''تم فکر نہ کرو۔'' وہ کہتا ہے ''میں ڈوب نہیں جاؤں گا بوکا ڈھونڈ کر جلد واپس آ جاؤں گا۔''

میں اسے آوازیں دیتا ہوں مگر وہ نہیں رکتا۔ رسی تھامے آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کی آواز اور آہٹ دور ہوتی جاتی ہے پھر اس کے پانی میں غوطہ لگانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سب منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر اندر جھانکتے ہیں مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں گھبرا کر پکارتا ہوں۔

''ابا۔۔۔۔۔''

میری آواز دیر تک کنوئیں کی دیواروں پر موٹر سائیکل چلاتی رہتی ہے پھر ڈوب جاتی ہے۔

''ڈوب گیا ہے۔''

''کیچڑ میں پھنس گیا ہے۔''

''مجھے پہلے ہی ڈر تھا۔''

میں اسے آوازیں دیتا ہوں وہ کوئی جواب نہیں دیتا میں کنوئیں میں لٹکتی بے حرکت رسی کو دیکھتا ہوں اور میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔ میری چیخ کی آواز سن کر وہ ساتھ والی چارپائی سے اٹھ کر میرے قریب آتا اور شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے۔

''کیا ہوا بیٹے۔۔۔۔۔۔خیریت تو ہے۔''

میں پسینے میں شرابور ابھی تک لرز رہا ہوں کانپتے ہاتھوں سے اسے ٹٹولتا اور پوچھتا ہوں۔

''ابا۔۔۔۔۔۔یہ تم ہی ہو نا۔۔۔۔۔۔بوکا نکال لائے ہو؟''

''معلوم ہوتا ہے۔'' وہ کہتا ہے ''تم نے بھی برا خواب دیکھا ہے۔''

''تم نے بھی دیکھا ہے ابا؟''

''ہاں بیٹے بہت برا''

''کیا دیکھا ہے ابا؟''

''میں نے دیکھا'' وہ کہتا ہے ''ایک دنبہ ہے سفید سفید اون اور بھاری خوبصورت چکی والا۔ میرے آگے آگے دوڑ رہا ہے۔ میں چھری لئے اس کے پیچھے بھاگتا ہوں مگر اسے پکڑ نہیں پا رہا ہوں۔ جب میں ہانپ جاتا ہوں تو کہتا ہوں۔ ''بزدل اللہ کی راہ میں جانے سے

ڈرتے ہو؟''

میری بات سن کر وہ رک جاتا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ گردن جھکا کر کہتا ہے۔''اچھا۔۔۔۔۔۔جیسے اس کی رضا۔''

میں اسے زمین پر لٹاتا ہوں گردن پر چھری رکھتا ہوں اور چلانا چاہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے۔''آنکھوں پر پٹی باندھ لو۔''

میں آنکھوں پر پٹی نہیں باندھتا اور اللہ اکبر پڑھ کر چھری چلا دیتا ہوں اور یہ دیکھ کر میری چیخ نکل جاتی ہے کہ اس کی جگہ تم ذبح ہوئے پڑے ہو۔۔۔۔۔۔استغفار بیٹے۔۔۔۔۔۔اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔''

کچھ دیر کے ہم دونوں خاموش ہو جاتے ہیں وہ زیر لب کچھ پڑھ کر میری طرف منہ کر کے پھونکنے لگتا ہے اور ابھی اس نے تیسری پھونک مارنا ہوتی ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا ابو ابو پکارتا اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ پھر اس کی ماں جاگتی ہے اور اسے سینے سے چمٹا کر وہ بھی رونے لگتی ہے۔ ابا اپنی پھونکوں کا رخ ان کی طرف کر لیتا ہے۔

وہ پوچھتی ہے''کیا وقت ہوگا؟''

''پتہ نہیں''میں جواب دیتا ہوں''کچھ پتہ نہیں چل رہا' آسمان دھند میں چھپا ہوا ہے کوئی ستارہ نظر نہیں آتا جس سے وقت کا اندازہ ہو سکے۔ عجیب رات ہے۔ لگتا ہے وقت ایک جگہ پر رک گیا ہے اور اب کبھی صبح نہیں ہوگی۔''

''کیا صبح نہیں ہوگی؟''وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

''ہوگی۔۔۔۔۔۔ضرور ہوگی تم سو جاؤ''ابا جواب دیتا ہے پھر کہتا ہے ضرور کہیں کچھ ہوا ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟''وہ اور پریشان ہو کر پوچھتی ہے۔

''کوئی انہونی بات' پتہ نہیں کس پر کیا گزری ہے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہوا تھا۔''

''کب۔۔۔۔۔۔کیا ہوا تھا ابا؟''

''یہ پرانی بات ہے بیٹے۔۔۔۔۔۔کتابوں میں لکھی ہے۔ دن چڑھے گا تو خود پڑھ لینا۔''

''دن چڑھے گا ابا؟''

''ہاں بیٹے۔۔۔۔۔۔ہر رات خواہ وہ کتنی ہی قیامت کی رات کیوں نہ ہو آخر کار ختم ہو جاتی ہے اور سورج نکلتا ہے صبح ہوتی ہے۔''

''اب کیا وقت ہوگا؟'' وہ پھر پوچھتی ہے۔

''صبح کاذب معلوم ہوتی ہے۔''

''اور صبح صادق؟''

''صبح کاذب کے بعد صبح صادق ہوتی ہے پھر شفق پھوٹتی ہے اور سورج طلوع ہوتا ہے۔''

''مگر مرغ نے اذان نہیں دی؟''

''ہاں۔۔۔۔۔۔مرغ نے اذان نہیں دی۔۔۔۔۔۔تم جاؤ۔۔۔۔۔۔جا کر دیکھو۔''

میں اٹھ کر ڈربے کے قریب آتا ہوں دروازہ کھولتا ہوں مرغ زندہ سلامت ہے مگر بری طرح خوفزدہ ہے اور ہانپ رہا ہے شاید اس نے بھی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے میں اسے پکڑ کر باہر نکالنا چاہتا ہوں مگر وہ سہمی ہوئی مرغیوں کے پروں میں سر چھپا کر دبک جانا چاہتا ہے میں اسے زبردستی پکڑ کر باہر نکالتا ہوں۔ اس کی گردن کو اوپر کرتا اور اسے بھینچ کر اس کے اندر سے آواز نکالنے کی کوشش کرتا ہوں مگر آواز نہیں نکلتی۔

''چھوڑ دے'' ابا کی آواز سنائی دیتی ہے۔'' ایسے آواز نہیں نکالی جا سکتی۔۔۔۔۔۔اور نکل بھی آئے تو ایسی اذان کا کیا فائدہ؟''

میں مرغ کو واپس ڈربے میں دھکیل دیتا ہوں اور آ کر اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ ابا کہتا ہے۔'' پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرغ اذان نہ بھی دے تو بھی وقت رکتا نہیں ہے۔''

''مجھے تو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔''

''نہیں بیٹے'' جب ہمیں وقت ٹھہرا ہوا لگتا ہے اس وقت دراصل ہم خود ٹھہرے ہوتے ہیں اندر اندھیرا ہو جائے تو دن رات ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں نیکی اور بدی کی پہچان نہیں رہتی عدل اور بے عدلی میں تمیز نہیں رہتی۔ مگر وقت چلتا رہتا ہے اور ہر رات کے بعد صبح کا اجالا ضرور پھیلتا اور چیزوں کی اصلی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔''

''اگر صبح نہ ہوئی تو'' وہ کہتی ہے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' ابا کہتا ہے'' پہلے کبھی ایسا ہوا ہے؟''

''پہلے کبھی ایسی ہولناک رات اور اس طرح کے بھیانک خواب بھی تو دکھائی نہیں دیئے۔''

''اللہ خیر کرے گا۔۔۔۔۔۔تم لوگ سو جاؤ۔''

''سو جائیں۔۔۔۔۔۔ی کیوں؟۔۔۔۔۔۔کس طرح؟''

''مجھے نیند نہیں آتی۔'' وہ کہتی ہے ''اور کاکا بھی بار بار ڈر کر چونکتا ہے۔''

''مجھے بھی نیند نہیں آرہی۔'' میں کہتا ہوں ''اور ڈر بھی لگتا ہے کہیں ویسا ہی خواب۔۔۔۔۔۔''

''نہیں بیٹے۔۔۔۔۔۔ابا کہتا ہے ''تم سو جاؤ۔۔۔۔۔۔میں جاگتا ہوں میں جاگتا اور پڑھتا رہوں گا تو تمہیں برے خواب دکھائی نہیں دیں گے۔''

اسی لمحے اچانک آہٹ سنائی دیتی ہے ہم چونک کر ڈربے کی طرف دیکھتے ہیں لگتا ہے مرغ ڈربے سے باہر نکل آیا اور اپنے پر پھڑ پھڑا کر اذان دینے کے لئے زور لگا رہا ہے مگر آواز اس کے حلق میں پھنس گئی ہے۔ زور لگاتے لگاتے وہ ہانپ جاتا اور اذان کو ادھورا چھوڑ کر ڈربے میں گھس جاتا ہے۔ جاگتے جاگتے اور حبس اور دھند کے سائبان میں ستارے تلاش کرتے کرتے ہماری آنکھیں تھک جاتی اور اعصاب شل ہو جاتے ہیں مگر روشنی اور صبح کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ لگتا ہے رات کا کوئی لمحہ ساکت ہو گیا ہے یا مرغ کے گلے میں اذان کی صورت اٹک گیا ہے۔ مگر پھر گرمی اور حبس کے باوجود نجانے کب اور کیسے میری آنکھ لگ جاتی ہے اور میں نیند کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں مگر ابھی میں نیند کے پہلے زینے پر قدم رکھتا ہوں کہ وہی ڈراؤنا خواب پھر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے جہاں میری آنکھ کھل گئی تھی۔

کیا دیکھتا ہوں کہ کنوئیں میں لٹکی ہوئی رسی اچانک ہلنے لگتی ہے میں اندر جھانکتا ہوں کان لگا کر سنتا ہوں اور کہتا ہوں۔۔۔۔۔۔و

''وہ ابھی ڈوبا نہیں۔۔۔۔۔۔بوکا ڈھونڈ رہا ہے۔''

وہ جاتے جاتے پلٹ آتے ہیں اور منڈیر پر کہنیاں ٹیک کر اندر جھانکتے ہیں پانی میں اس کے چلنے اور حرکت کرنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے پھر اس کی آواز گونجتی ہے ''بوکا مل گیا ہے۔''

سب خوش ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اس کی آواز پھر آتی ہے۔

''میں بوکا لے کر اوپر آرہا ہوں۔''

''مجھے پہلے ہی یقین تھا۔'' ایک کہتا ہے۔ ''وہ خالی ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''کمال کا آدمی ہے۔''

''میں کہتا ہوں۔۔۔۔۔۔و پہلے یہ پتہ چلانا چاہیے کہ بار بار چھینک کون دیتا ہے؟''

''چپ کراوئے۔۔۔۔۔۔شکر کرو مل گیا ہے۔''

''کچھ فائدہ نہیں۔۔۔۔۔ی جب تک اس کو نہ پکڑا جائے جو بار بار پھینک دیتا ہے۔''

''میں بتاؤں وہ کون ہے؟'' پیچھے سے ایک شخص سب کو دھکیلتا ہوا آگے آ کر کہتا ہے۔

''بتاؤ''

وہ نیفے میں سے چھری نکالتا ہوا میں لہراتا اور تنی ہوئی رسی کاٹ دیتا ہے۔ پھر ہنستا ہوا ایک طرف چلا جاتا ہے۔ دہشت اور خوف کے مارے سب خاموش رہتے ہیں۔ کنوئیں کے اندر سے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔

میری چیخ کی آواز سن کر وہ۔۔۔۔۔۔ساتھ والی چارپائی سے اٹھ کر میرے قریب آتا اور جھک کر کہتا ہے۔

''اٹھو بیٹے۔۔۔۔۔جلدی کرو۔۔۔۔۔۔دن نکل آیا ہے۔''

''دن نکل آیا ہے؟''

''ہاں''

''مگر ابھی تو صبح کاذب تھی۔''

''ہاں بیٹے۔۔۔۔۔آج صبح کاذب ہی کے وقت سورج نکل آیا ہے۔ پتہ نہیں اب کیسی شکر دوپہر ہمارا راستہ روکے کھڑی ہے۔''

◆◆◆

تماشا

اندھیرے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ کنارے پر جگہ جگہ ادھ کھائی اور مری ہوئی مچھلیاں بکھری پڑی ہیں۔ چھوٹا کہتا ہے ''یہ لدھروں کی کارستانی لگتی ہے ابا''

''ہاں پتر'' بڑا کہتا ہے۔ ''یہ ایسا ہی کرتے ہیں ضرورت سے زیادہ مچھلیاں مار مار کر جمع کرتے رہتے ہیں مگر کھاتے وقت آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور شکار کو خراب اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے ہیں۔''

''یہ اتنی ساری مچھلیاں'' چھوٹا کہتا ہے۔ ایک رات میں اتنی مچھلیاں مارتے ہیں۔۔۔۔۔ ی تو دریا مچھلیوں سے خالی نہ ہو جائے گا؟''

''اگر لدھروں کی تعداد بڑھتی رہی تو ایسا ہو سکتا ہے۔''

وہ سامان رکھ کر کنارے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پار دیکھتے ہیں بستی۔۔۔۔۔ جہاں انہیں پہنچنا ہے اس کی مسجد کے مینار صاف نظر آتے ہیں مگر اس تک پہنچنے کے لئے پل ہے نہ کشتی۔ وہ پریشان ہو کر دریا کی طرف دیکھتے ہیں۔ دریا ہر جگہ سے ایک جیسا گہرا اور چوڑا ہے۔ بڑا کچھ دیر تامل کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے 'اللہ کا نام لے کر ٹھل پڑتے ہیں پتر''

''جیسے تمہاری مرضی ابا''

''اگر ڈوب گئے تو؟''

''تو آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔''

''تو کافی ہوشیار ہو گیا ہے جمورے'' بڑا ہنستے ہوئے کہتا ہے۔

''تمہارا بیٹا جو ہوا ابا''

''ضرور ٹھل پڑتے پتر'' بڑا کچھ دیر سوچنے کے بعد کہتا ہے۔ ''مگر مجھے رات والا خواب یاد آ رہا ہے۔''

''کیسا خواب ابا؟''

''بہت ڈراؤنا خواب تھا پتر''

''کیا دیکھا تھا ابا؟''

''میں نے دیکھا جمورے کہ بہت بڑا مجمع ہے۔ میں تماشائیوں کے درمیان کوڈیوں والے کو گلے میں ڈالے کھڑا ہوں۔ بچے تالیاں بجاتے اور بڑے زمین پر بچھی چادر پر سکے پھینک رہے ہیں کہ اچانک کوڈیوں والا جسے میں نے تمہاری طرح لاڈ پیار سے پالا ہے میری گردن میں دانت گاڑ دیتا ہے اور اپنا زہر انڈیل دیتا ہے۔''

''پھر کیا ہوا ابا؟''

''پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ لوگوں کے چہرے دھندلا جاتے اور آوازیں ڈوب جاتی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں موت ایسی نیند کے اندھے کنوئیں میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈوبتے ڈوبتے رہی سہی طاقت جمع کر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں آواز کا تی پھینکتا اور تمہیں پکارتا ہوں۔''

''پھر؟''

''پھر میں اپنی ہی چیخ کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کیا دیکھتا ہوں کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ چاند ڈوب چکا ہے۔ کتے رو رہے ہیں اور اوس سے بوجھل ہوا اداس اداس سی پھر رہی ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر میں نے دیکھا کہ تم ٹھنڈک کی وجہ سے سمٹے ہوئے ہو میں نے تمہارے اوپر چادر ڈال دی جیسے اکھاڑے میں تمہارے گلے پر چھری چلانے اور تمہیں دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ڈالا کرتا ہوں مگر رات کے اس اداس پہر میں مجھے اپنی چادر ڈالنے کا یہ انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا اور نیند اڑ گئی۔''

''بس'' چھوٹا کہتا ہے۔ ''اس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہمیں دریا میں نہیں اترنا چاہیے۔''

''ہاں پتر آج کا دن ہمارے لئے اچھا نہیں ہے۔''

وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا اور سستانے لگتا ہے۔ چھوٹا ابھی تک تازہ دم ہے دوڑ دوڑ کر ٹیلوں پر چڑھتا اترتا ہے اور اچانک پکارتا ہے۔

''ابا پل۔۔۔۔۔۔ مجھے پل دکھائی دے رہا ہے زیادہ دور نہیں ہے۔''

پل کا نام سن کر بڑے کے بوڑھے جسم میں زندگی کی تازہ لہر دوڑ جاتی ہے وہ اٹھ کر بھاگتا ہوا ٹیلے پر آتا ہے اور اس طرف کو دیکھتا

ہے جدھر پانی بہتا ہے پھر خوش ہو کر کہتا ہے۔ ''ہاں پل زیادہ دور نہیں۔۔۔۔۔۔ی مگر راستہ دشوار گزار ہے۔''

''کوئی بات نہیں ابا۔''

دونوں اپنا اپنا سامان اٹھا لیتے اور دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ راستہ مشکل ہے۔ بہت سے نشیب و فراز ٹیلے اور کھائیاں۔ ندی نالے' گھنا جنگل' خاردار جھاڑیاں اور پاؤں لہولہان کر دینے والے دوب۔۔۔۔۔۔ مگر وہ چلتے رہتے ہیں۔ چلتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے کنارے پر بستی کی مسجد کے اونچے مینار بھی چلتے رہتے ہیں۔ چلتے چلتے وہ تھک جاتے ہیں۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی ہے مگر پل اب بھی اتنا ہی دور نظر آتا ہے جتنا اس وقت نظر آتا تھا جب وہ چلے تھے۔ بڑا کہتا ہے۔

''عجیب بات ہے جمورے۔۔۔۔۔۔ پل آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے۔''

''اور بستی بھی ابا'' چھوٹا کہتا ہے۔ ''مینار ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔''

''عجیب بات ہے جمورے''

''بہت ہی عجیب ابا''

''یہ کوئی اسرار پتر''

''میرا خیال ہے ابا'' چھوٹا کہتا ہے۔ ''ہم ہر روز لوگوں سے مخول کرتے ہیں آج ہمارے ساتھ مخول ہو رہا ہے۔''

چلتے چلتے دوپہر ڈھلنے لگتی ہے۔ وہ تھک کر نڈھال ہو جاتے ہیں۔ دریا کا گدلا پانی پی پی کر ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں۔ خاردار جھاڑیوں سے الجھ الجھ کر لباس تار تار ہو جاتا اور پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں مگر پل اور بستی کے مینار اب بھی اتنے ہی فاصلے پر نظر آتے ہیں۔

''رک جا پتر'' بڑا کہتا ہے ''اس پار والی بستی تک پہنچنا شاید ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔ ہم اس سے آگے چلتے ہوئے پل تک کبھی نہ پہنچ پائیں گے۔''

''پھر کیا کریں ابا؟''

''واپس چلتے ہیں پتر؟''

''نہیں ابا' واپس جا کر کیا کریں گے۔ ہماری منزل تو اس پار کی بستی ہے اور پھر ابا۔۔۔۔۔۔ واپس پلٹ جانا مردوں کا کام نہیں ہے۔''

''ہاں پتر تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔۔ہماری تو زنانیاں بھی دریا کی بپھری ہوئی لہروں سے نہیں ڈرتیں۔۔۔۔۔ی کچے گھڑوں پر ٹھل پڑتی ہیں۔''

''واہ ابا۔۔۔۔۔۔کیا بات ہی ہے۔۔۔۔۔۔چلو ٹھل پڑتے ہیں۔''

''نہیں پتر۔۔۔۔۔۔تم تھک جاؤ گے۔۔۔۔۔۔اور پھر ہمارے پاس سامان ہے۔''

''تم میری فکر نہ کرو ابا۔۔۔۔۔۔اور سامان کا کیا ہے وہاں جا کر نیا بنا لیں گے۔''

بڑا کوئی جواب نہیں دیتا' سامان نیچے رکھ کر دریا کی طرف دیکھتا رہتا ہے پھر گانے لگتا ہے۔۔۔۔۔۔''ئمیہہ وی ڈونگھی حلہ پرانا شینھاں تاں پتن ملے''

چھوٹا لقمہ دیتا ہے''میں وی جاناں جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے''

اچانک کتوں کے بھونکنے اور مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

''یہ آوازیں؟''چھوٹا کہتا ہے''اس جنگل بیابان میں؟''

''میرا خیال ہے یہاں قریب ہی کوئی آبادی ہے کوئی دوسری بستی۔''

''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔''

''پتر کیوں نہ آج کی رات یہیں اس بستی میں گزار لیں صبح سویرے تازہ دم ہو کر چلیں گے۔''

''جیسے تمہاری مرضی ابا۔''

بڑا کچھ دیر سوچتا رہتا ہے پھر آوازوں کے تعاقب میں چلنے لگتا ہے چھوٹا پلٹ پلٹ کر دریا کے اس پار والی بستی کی طرف دیکھتا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔دریا کا کنارہ لحظہ لحظہ دور ہوتا جاتا ہے اور وہ چھوٹی سی ایک بستی کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

اچانک بڑا ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بیری کے درخت کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔''یہ کیا تماشا ہے جمور یا''

جمورا بیری کی طرف دیکھتا ہے۔زمین سے مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر مارتا ہے پھر زمین سے بیر اٹھا کر چکھتا اور تھوک دیتا ہے۔

''ہاں ابا۔۔۔۔۔۔دھر کونے ہی ہیں کڑوے زہر۔''

''رب خیر کرے بیری کے ساتھ دھر کونے؟''بڑا کہتا ہے۔''کوئی اسرار ہے پتر''

چھوٹا کوئی جواب نہیں دیتا آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا رہتا ہے۔

بڑا کہتا ہے۔"ابابیلیں ہیں پتر"

"ہاں ابا۔۔۔۔۔۔پورا لشکر ہے"

"دانہ دنکا ڈھونڈ رہی ہوں گی پتر"

"کیا پتہ کچھ اور ڈھونڈ رہی ہوں ابا"

"اور کیا پتر؟"

"ہاتھیوں کو ابا"

"نہیں پتر۔۔۔۔۔۔یہ وہ ابابیلیں نہیں ہیں۔یہ تو ہاتھیوں پر بیٹھ کر چھپاے اور چوگ بدلنے والی ابابیلیں ہیں۔"

"یہاں سے نکل چلیں ابا۔۔۔۔۔۔یہ ٹھیک جگہ نہیں ہے۔"

"رب خیر کرے گا پتر"۔۔۔۔۔۔بڑا کہتا ہے"کچھ دھندا کر لیں۔رات بسر کر کے صبح سویرے نکل چلیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی ابا۔"

بستی میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کھلی جگہ پر سامان رکھ کر آس پاس کا جائزہ لیتے ہیں۔پھر چھوٹا زمین پر چادر بچھا کر اس کے ایک کونے پر بیٹھ جاتا ہے اور بڑا بانسری اور ڈگڈگی نکال کر بجانے لگتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔بڑا چھوٹے کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو"اب رات بسر کرنے کا اچھا بندوبست ہو جائے گا۔"

بڑا بانسری اور ڈگڈگی بجاتا رہتا ہے۔جب تھک جاتا ہے تو کہتا ہے۔

"پتر جمورے۔۔۔۔۔۔یہ بستی بھی عجیب ہے۔ڈگڈگی بجاتے بجاتے میرا بازو شل ہو گیا ہے اور بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے میرا اندر سکھناں ہو گیا ہے مگر ابھی تک کسی بالغ مرد عورت نے جس کے کھیسے میں پیسہ دھیلا ہو ادھر کا رخ نہیں کیا۔

"کیا پتہ ابا"چھوٹا کہتا ہے"یہاں کے مرد عورتیں بہرے ہوں یا انہوں نے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہو۔"

"وہ کیوں پتر؟"

"وہ اس لئے ابا۔۔۔کہ جب بندہ کبھی بھی خیر کی خبر نہ سنے تو آہستہ آہستہ اس کا دل اکا سننے ہی سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔"

"واہ جمورے تو نے سبق خوب پکایا ہوا ہے اچھا یہ بتا تجھے کیسے پتہ چلا کہ ان لوگوں نے کبھی خیر کی خبر نہیں سنی۔"

''میں نے ان نیانوں کی صورتوں سے اندازہ لگایا ہے ابا''

''تو بہت ہوشیار ہو گیا ہے جمورے''

''تمہارا چیلا جو ہوا ابا''

''واقعی پتر۔۔۔۔۔۔ایسا لگتا ہے جیسے یہ سارے یتیم ہیں۔''

''مجھے تو ایسا لگتا ہے ابا جیسے انہوں نے اپنے باپوں کو خود شہر بدر کر دیا ہو۔''

''شاید ہم غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔''

''ہاں ابا''

''دیکھنا پتر۔۔۔۔۔۔ساری بستی میں کوئی ایک بھی بالغ مرد عورت نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب بھی ہماری طرح دوسری بستیوں میں تماشا دکھانے گئے ہوئے ہوں۔''

''پھر تو ان کی واپسی کا انتظار ضرور کرنا چاہیے ابا''

''کیوں پتر؟''

''یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ بڑے مداری ہیں یا تم؟''

''نہیں جمورے مجھے ان بچوں سے خوف آنے لگا ہے عجیب سے بچے ہیں۔''

''تو پھر یہاں سے بھی چلتے ہیں ابا''

''ہاں پتر۔۔۔۔۔۔چلے جانا ہی اچھا ہے مگر تو ذرا ان چھوٹوں سے یہ تو پوچھ ان کے بڑے کہاں ہیں؟''

''ہم خود بڑے ہیں۔'' مجمع میں سے ایک بچے کی آواز آتی ہے۔ ''کیا ہم تمہیں چھوٹے نظر آتے ہیں۔''

بڑا اور چھوٹا ایک دوسرے کی طرف چونک کر دیکھتے ہیں اور ابھی اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ چھوٹی عمر کا ایک اور بچہ نہایت پختہ لہجے میں کہتا ہے۔

''منشی ٹھیک کہتا ہے۔۔۔۔۔۔تم لوگ جلدی جلدی کھیل دکھاؤ اور اپنی راہ لو۔۔۔۔۔۔ہم ایسے لوگوں کو جو خود کو ہم سے بڑا سمجھتے ہوں بستی میں زیادہ دیر رکنے کی اجازت نہیں دیتے۔''

''تو کیا اس بستی میں پورے قد کا کوئی آدمی نہیں رہتا؟''

''ہم رہنے ہی نہیں دیتے۔'' ایک بچہ ہنس کر کہتا ہے ''ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔''

''تو یہ بستی؟'' بڑا ہکلا جاتا ہے۔

''ہاں یہ بستی۔۔۔۔۔۔۔یہ ہماری بستی ہے اور میں یہاں کا سردار ہوں لیکن تم وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم نے کوئی اچھا کرتب دکھایا تو ہم تمہیں ضرور انعام دیں گے۔۔۔۔۔۔۔چلو تماشا دکھاؤ۔''

''ابھی تو ہم خود دیکھ رہے ہیں۔'' چھوٹا کہتا ہے۔

''تمیز سے بات کرو لڑکے۔'' سردار غصے سے کہتا ہے۔ ''ورنہ۔۔۔۔۔۔۔''

''ارے'' چھوٹا ہنستا ہے۔ ''تم تو واقعی سردار کے بیٹے لگتے ہو۔''

''سردار کا بیٹا نہیں' میں خود سردار ہوں۔''

''ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔یہ سردار ہے۔'' بہت سی آوازیں آتی ہیں۔ چھوٹا ہنستا چلا جاتا ہے پھر بڑے کے قریب آ کر کہتا ہے۔ ''میرا خیال ہے ہم بونوں کی بستی میں آ گئے ہیں۔''

''مداری۔۔۔۔۔۔۔یہ کیا بکواس ہے؟'' سردار چلا کر کہتا ہے۔ ''یہ ہمیں بونے کہتا ہے۔ اس بدتمیز بچے کو چپ کراؤ ورنہ بستی سے نکل جاؤ۔'' بڑا ششدر کھڑا چاروں طرف دیکھتا ہے پھر کہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔''جمورے چپ ہو جا' یہ کوئی اسرار ہے۔''

''کیا اسرار ہے ابا۔۔۔۔۔۔۔یہ بچے''

''یہ بچے نہیں ہیں پتر'' بڑا اس کی بات کاٹ کر کہتا ہے۔

''پھر کیا ہیں ابا؟''

''غور سے دیکھ جمورے۔۔۔۔۔۔۔ان کے بال سفید ہیں اور ان کے چہروں پر جھریاں ہیں ان کی عمریں زیادہ ہو گئی ہیں مگر ان کے ذہن نابالغ رہ گئے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں۔

''عجیب بات ہے۔''

''بہت ہی عجیب پتر۔۔۔۔۔۔۔رب خیر کرے۔''

اچانک چند بچے بہت سے چارپائیاں اور مونڈھے اٹھائے آتے ہیں اور سردار بچے سمیت بہت سے دوسرے تماشائی بچے بھی ان چارپائیوں اور مونڈھوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سردار تحکمانہ لہجے میں کہتا ہے۔

"کھیل شروع کیا جائے۔"

بڑا پریشان ہو کر تماشائیوں پر ایک نظر ڈالتا ہے پھر تھیلے میں سے چیزیں نکالنے لگ جاتا ہے۔

سب سے پہلے وہ تین گولے نکال کر زمین پر رکھتا ہے پھر انہیں تین پیالوں سے ڈھانپ دیتا ہے۔ کچھ پڑھ کر پھونک مارتا اور باری باری سارے پیالے اٹھا کر دکھاتا ہے۔ گولے غائب ہو چکے ہیں۔

وہ تماشائیوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا ہے مگر وہ تالیاں نہیں بجاتے' داد نہیں دیتے چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں۔

پھر وہ پیالوں کو اوندھا کر کے باری باری اوپر اٹھاتا ہے۔ اب ہر پیالے کے نیچے ایک ایک گولہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ دوبارہ سردار اور دوسرے تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے مگر وہ اب بھی خاموش رہتے ہیں۔

پھر وہ جیب سے ایک روپے کا سکہ نکالتا ہے۔ ایک کے دو اور دو کے چار بناتا ہے اور کہتا ہے۔ "مہربان ـــــ قدردان ـــــ میں جادوگر نہیں ہوں۔ یہ محض ہاتھ کی صفائی ہے۔ جادوگر ہوتا تو یہاں نہ ہوتا گھر میں بیٹھا سکے بنا رہا ہوتا۔"

"ہمیں معلوم ہے' تم کھیل دکھاؤ۔" سردار اسے ٹوکتا ہے۔

"تو پھر تم خود ہی میدان میں آ جاؤ۔" جمورا کہتا ہے۔

"مداری! یہ لڑکا ـــــ" سردار غضبناک ہو جاتا ہے۔

"میں معافی چاہتا ہوں سردار" بڑا کہتا ہے اور اشارے سے جمورے کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے اور باری باری بہت سے کھیل دکھاتا ہے۔

خالی گلاس پانی سے بھر جاتا ہے اور بھرا ہو گلاس اوندھا کرنے سے پانی نہیں گرتا۔ مٹھی میں بند کر کے نکالنے سے رومال کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ جلتا ہوا سگریٹ نگل کر کانوں کی طرف سے دھواں نکالتا ہے۔ کوڈیوں والے سے ڈسواتا ہے اور اسے گردن میں ڈال لیتا ہے۔ منہ کے راستے پیٹ میں خنجر اتار کر نکال لیتا ہے۔

مگر سردار سمیت کوئی تماشائی تالی نہیں بجاتا' داد نہیں دیتا۔ وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ پھر اعلان کرتا ہے۔ ـــــ "اب آخر میں جمورے کے گلے پر چھری چلاؤں گا اور اسے ذبح کر کے دوبارے زندہ کر کے دکھاؤں گا۔"

سردار سمیت سارے تماشائی زور زور سے تالیاں پیٹتے ہیں وہ بے حد حیران ہوتا ہے۔ عام طور پر تماشے کے آخر میں اس کھیل کا اعلان کیا کرتا ہے تو بہت سے تماشائی اس کھیل کو ناپسند کرتے اور اسے منع کر دیتے ہیں مگر پتہ نہیں یہ کیسے سفاک تماشائی ہیں کہ چھری چلانے کی بات سن کر تالیاں پیٹنے لگے ہیں۔

وہ جمورے کو زمین پر لٹاتا ہے اس کے اوپر اسی طرح چادر ڈالتا ہے جیسے ہمیشہ ڈالا کرتا ہے۔ پھر تھیلے میں سے چھری نکال کر اس کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے۔۔۔۔۔۔ ''صاحبان! قدر دان! کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چھری نہیں چلا سکتا ۔۔۔۔۔۔ نہ ہی اللہ کے پیغمبروں کے سوا کسی میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ ایک کھیل ہے۔۔۔۔۔۔ نظر کا دھوکہ۔۔۔۔۔۔ اس پاپی پیٹ کی خاطر۔''

''باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔'' سردار کہتا ہے۔

''چھری چلاؤ۔۔۔۔۔۔'' ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

''چھری چلاؤ۔۔۔۔۔۔ چھری چلاؤ'' تماشائی شور مچاتے ہیں۔

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور جمورے کے قریب آ کر چھری چلاتا ہے۔ تماشائی زور زور سے تالیاں اور سیٹیاں بجاتے' سکے پھینکتے اور بکرے بلاتے ہیں اور جمورے کے دوبارہ زندہ ہونے کا کھیل دیکھے بغیر کھسکنے لگتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا پڑ خالی ہو جاتا ہے۔

وہ جمورے کو آواز دیتا ہے۔ ''اٹھ پتر۔۔۔۔۔۔ پیسے جمع کر۔''

مگر جمورا کوئی جواب نہیں دیتا۔

وہ گھبرا کر چادر ہٹاتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ جمورا خون میں لت پت ہے اور اس کی گردن سچ مچ کٹی پڑی ہے۔

اس کی چیخیں ساری بستی میں گونجنے لگتی ہیں۔

◆◆◆

کاشی

اس کا نام کاشی ہے اور وہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے یوں تو ہر باپ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے مگر میں کاشی سے بہت محبت کرتا ہوں اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں ایک تو یہی کہ ڈھلتی عمر کی اولاد ویسے ہی زیادہ عزیز ہوتی ہے شاید آدمی اس کے مستقبل کی متوقع خوشیاں نہ دیکھ سکنے کے خوف میں مبتلا ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ عمر کے اس دور میں پہنچتے تک آدمی ریاکاریوں' منافقتوں اور مکاریوں کے اتنے خارزار عبور کر چکا ہوتا ہے کہ چلتے چلتے پاؤں کے نیچے جب کبھی معصومیت کی نرم نرم اور ہری بھری گھاس آجاتی ہے تو اسے عجب میٹھی میٹھی گدگدی کا احساس ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے اوائل عمری میں جب دل میں خودرو پودے اگتے اور ان میں جذبوں کے شگوفے پھوٹتے تھے تو میں کسی کے بارے میں کوئی اندوہناک خبر سن کر اس قدر ملول ہو جاتا تھا کہ بھوک مر جاتی اور نیند اڑ جاتی تھی مگر پھر جب اندر اگنے والے خوشنما اور نازک پودے بڑھ کر تناور درخت بن گئے تو آہستہ آہستہ میرا سارا اندر کاٹھ کا ہو گیا۔ لطیف جذبوں کے پرندے بہت کم ادھر کا رخ کرتے اور اگر کبھی کرتے تو تھوڑی دیر کے لئے کسی ڈال پر بیٹھ کر چہچہاتے مگر پھر کرخت سوچوں کا کلہاڑا چلنے کی آواز سن کر فوراً ہی اڑ جاتے۔ اب مجھے اپنی عمر کے ہر آدمی کی طرح ہر بات میں مکاری' عیاری اور جھوٹ کی ملاوٹ نظر آنے لگی ہے۔ شاید اس لئے کہ میں نے ہر جگہ یہی کچھ دیکھا اور برتا۔ اگر کہیں کسی بات میں مکاری نہ بھی ہو تو میرا ذہن اپنے پاس سے اس کی آمیزش کر لیتا ہے۔

ایک وقت تھا کہ افسانہ یا ناول پڑھتے اور ڈرامہ یا فلم دیکھتے ہوئے میں ہیرو یا ہیروئین کی ٹریجڈی پر بے اختیار رو پڑتا تھا مگر اب ہیروئین زہر پھانکتی یا ہیرو پھانسی چڑھتا ہے تو مزے سے آئس کریم کھاتا اور کوک پیتا رہتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندر جذبوں اور احساسات کے دریاؤں کی ساری مچھلیاں خود غرضی کے اود بلاؤں نے مار کر کھا لی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ ناول یا فلم میں کسی بچے کی ماں مر جاتی تو اپنی ماں کی موت پر روکا ہوا بیشمار رونا میرے دامن ضبط کو تار تار کر دیتا تھا مگر اب ہیرو کی ماں مر جاتی ہے تو میری خبیث آنکھ اس ٹوہ میں ہوتی ہے کہ مرنے کی اداکاری کرنے والی اداکارہ کی بھنوؤں یا ہونٹوں میں کسی قسم کی جنبش تو نہیں ہو رہی؟ ایسی باتوں پر جن سے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ اب میں ناک بھوں چڑھاتا ہوں مجھے ان عمومیت بازاری پن اور اوور ایکٹنگ کی بو آتی ہے۔ اخبارات میں آئے دن اندوہناک مظالم اور انسانی بربریت کے واقعات پڑھتا رہتا ہوں اور لمحہ بھر کے لئے ناگواری کا احساس مجھے بدمزہ بھی کر دیتا ہے مگر پھر سب کچھ اندر کے سور کے پیچھے بھونکتے

کتوں کے شور میں دب جاتا ہے۔

پتہ نہیں کیوں جوں جوں ہماری عمریں کم ہوتی جاتی ہیں ہم زیادہ خودغرض اور بے رحم ہو جاتے ہیں۔ہم ایسی چیزوں' لوگوں حتیٰ کہ قریبی عزیزوں سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتے جن سے ہمیں جلد یا بدیر کسی مالی منفعت کی توقع یا نقصان کا احتمال نہ ہو۔پچھلے برس ہمارے پڑوس میں ایک ایسا ہی خاندان آ کر آباد ہوا۔محلے میں کوئی مرے یا جئے ان کی بلا سے۔۔۔۔۔۔دوسرے لوگوں کی طرح ہم نے بھی انہیں شادی غمی کی ہر تقریب میں بلایا مگر انہوں نے معذرت کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔کاشی کبھی کھیلتا ہوا ان کے گھر چلا جاتا تو وہ اس ڈر سے کہ ان کی چیزیں الٹ پلٹ نہ دے نہایت رکھائی سے اسے باہر نکال دیتے اور دروازہ بند کر لیتے۔مگر جب سے ہمارے ہاں ٹیلیفون لگا ہے اور ان لوگوں کی لوکل اور ٹرنک کالیں آنے جانے لگی ہیں ان لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ بالکل اپنوں جیسا ہو گیا ہے۔یوں لگتا ہے جیسے ٹیلیفون کے تار ان کے دلوں کے گرد سے ہوتے ہوئے ہم تک پہنچتے ہیں۔اب ہمارے ہاں ذرا سا کوئی بیمار پڑ جائے تو ان کے دلوں میں محبت اور بھائی چارے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔کاشی کے لئے اکثر کھلونوں' مٹھائیوں اور پھلوں کے تحفے آتے رہتے ہیں اور اگر وہ کسی روز ان کے گھر کھیلنے نہ جائے تو آنٹی کو اپنا گھر اور آنگن سونا سونا لگنے لگتا ہے۔

کاشی سے میری بے پناہ محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے فنا کا خوف جو میرے ذہن اور روح سے ہر لمحے چمٹا رہتا تھا وہ بہت حد تک دور ہو گیا ہے۔اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے بعد کاشی اور کاشی کے کاشی کی صورت میں زندہ رہوں گا۔ دیئے سے دیا جلتا رہتا ہے۔جلتا چلا جاتا ہے۔انسان اتنا فانی بھی نہیں ہے۔

کاشی میرا مستقبل بھی ہے جو ہمیشہ خوش آئند ہوتا ہے اور ماضی بھی۔اس کی شکل وصورت اور بہت سی عادتیں مجھ سے ملتی جلتی ہیں اور میں اس کی شکل وصورت میں اپنے بچپن کو بالغ نظروں سے دیکھتا اور خوش ہوتا ہوں۔میں اسے وہ سارے کھیل کھیلتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں جو میرے کھیلنے سے رہ گئے تھے۔میں اسے وہ ساری محبتیں دینا چاہتا ہوں جن سے میں بچپن اور زندگی میں محروم رہا اور میں اسے وہ ساری چیزیں کھلانا پلانا چاہتا ہوں جن کے لئے میں ترستا رہا۔میرا جی چاہتا ہے اسے ہر وقت وہ آم چوستے ہوئے دیکھتا رہوں جو بچپن میں ایک بار سوتیلی ماں نے میرے ہاتھ سے چھین کر خود کھا لیا تھا۔

کاشی نے جب سے بولنا اور چلنا پھرنا سیکھا ہے' میں فارغ اوقات میں اسے اکثر اپنے ساتھ رکھتا ہوں دوستوں کی بیوفائیوں اور رشتہ داروں کے حاسدانہ رویوں سے اکتا کر میں نے اس کی محبت میں پناہ ڈھونڈ لی ہے۔ہم دونوں اکثر ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے اور بازاروں' باغوں اور پارکوں میں اکٹھے گھومتے ہیں۔میں اس کے ساتھ ہم عمر دوست کا سا سلوک کرتا ہوں اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور کھیلوں میں پوری دلچسپی لیتا ہوں۔اگر وہ تتلی پکڑنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو میں تتلی پکڑ کر اس پر اپنے بڑے ہونے کا رعب نہیں جماتا۔تتلی نہ پکڑ سکنے کی اداکاری کر کے اس کی انا کو تسکین پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔لیکن اب وہ پہلے کی نسبت کافی

سمجھدار ہو گیا ہے ورنہ پچھلے سال جب وہ میرے ساتھ بازار جاتا تھا تو میری آنکھ بچا کر مٹھائی یا ٹافیوں کی کسی دکان میں گھس جاتا اور دکاندار سے کہتا۔ ''یہ دے دو۔''

مگر اسے پتہ چل گیا ہے کہ یہ چیزیں ایسے نہیں مل جاتیں ان کے لئے پیسے دینا پڑتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں پیسے اور سکے کی اہمیت واضح ہوتی جارہی ہے مگر ابھی اسے حساب کتاب کا شعور نہیں ہے' نہ اسے یہ معلوم ہے کہ پیسے کہاں سے اور کیسے آتے ہیں اس کا خیال ہے کہ ہر چیز کی قیمت ایک چونی ہوتی ہے ایک روز جوتوں کی دکان سے سامنے سے گزرتے ہوئے کہنے لگا۔

''مجھے نئے جوتے لے دیں۔''

میں نے کہا'' پھر کبھی لے دوں گا۔''

اس نے اصرار کیا اور کہا'' ابھی لے دیں نا''

اس پر میں نے کہا'' بیٹے میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔''

اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چونی نکال کر کہنے لگا'' میرے پاس ہیں۔''

میں اس کی ایسی معصومانہ باتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں لیکن یہ خیال مجھے فوراً ہی افسردہ کر دیتا ہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب اسے گنتی یاد ہو جائے گی۔ چیزوں کی قیمتوں اور اپنی قوت خرید کا شعور حاصل ہو جائے گا اور ہندسوں اور اعداد کے چکر میں پڑ کر اس کے سارے سہانے خواب چور ہو جائیں گے۔

ہم سیر کے لئے نکلتے ہیں تو میں اس خیال سے کہ اس میں زندگی کی دشواریوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا ہو اس کے لئے نسبتاً مشکل راستوں کا انتخاب کرتا ہوں اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہوں مگر وہ اس کا برا نہیں مناتا۔ اسے آسان اور مشکل راستوں کا فرق معلوم نہیں ہے اس لئے اگر کبھی سیڑھیاں اونچی ہوں اور اس سے عبور نہ ہو سکتی ہوں تو وہ بیٹھ کر اور گھسٹ کر انہیں عبور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے فٹ پاتھ پر بچ بچا کر گزر جاتا ہے مگر بنانے والوں کی نیت اور کارکردگی پر شک کا اظہار نہیں کرتا۔ مین ہول کے ڈھکنے چوری کرنے والوں کو گالیاں نہیں دیتا اور کارپوریشن کے عملے کی نااہلی کا شکوہ نہیں کرتا۔ میں سوچتا ہوں کاشی کتنے مزے میں ہے۔ حقیقت سے آگاہ ہو کر آدمی کتنا غیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ ذہنی طور پر نابالغ لوگ کتنی سادگی اور معصومیت سے استحصالی قوتوں اور صورت حال کا شکار رہتے ہیں مگر کتنے مطمئن اور قانع نظر آتے ہیں۔

کاشی کو ہر بچے کی طرح پرندے اور جانور اور ان کی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں میں اسے تمام کہانیاں جو مجھے یاد تھیں سنا چکا ہوں

لیکن اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ میں ہر بار نئی کہانی سناؤں۔ چنانچہ میں جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں اپنے پاس سے گھڑ گھڑ کر سناتا رہتا ہوں۔ اس طرح میرا اپنا بھی کیتھارسس ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً میں نے پچھلے دنوں اسے طوطوں والی ایک کہانی سنائی۔ اس کہانی میں ایک باغ کا ذکر تھا جس میں طرح طرح کے خوبصورت اور پھلدار درخت تھے مگر جب بھی بور آتا اور پھل لگتے تو قریبی جنگل سے ہر یل طوطوں کی ایک ڈار آ جاتی اور کچے پھلوں کو کتر کتر کر نیچے پھینکنے لگتی۔ یوں ہر بار پھلوں کے پکنے سے پہلے سارے پیڑ ویران اور بے ثمر ہو جاتے۔

کاشی ابھی کمسن ہے اس لئے اسے کہانی سنانے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ وہ سوال جواب نہیں کرتا۔ اور ہر بات چپکے سے تسلیم کر لیتا ہے مثلاً طوطوں والی اس کہانی کو سن کر وہ یہ نہیں پوچھتا کہ اس باغ کے رکھوالے کہاں ہیں اور کیا کرتے رہتے ہیں' وہ اپنی غلیلوں سے ان کو مار کر بھگا کیوں نہیں دیتے۔

میں چونکہ کاشی سے محبت کرتا ہوں اس لئے اس کے بارے میں ہر وقت فکر مند رہتا ہوں مجھے ہر وقت خوف لگا رہتا ہے کہ وہ ٹرائی سائیکل سے گر کر زخمی نہ ہو گیا ہو چاقو یا بلیڈ سے انگلی نہ کاٹ بیٹھا ہو' چولہے کے قریب جانے پر اس کا ہاتھ پاؤں نہ جل گیا ہو۔ اس نے کوئی سکہ نہ نگل لیا ہو یا کسی دوسرے بچے نے پتھر مار کر اس کی آنکھ نہ پھوڑ دی ہو۔ رات کو وہ زکام کی وجہ سے زور زور سے خراٹے لیتا ہے تو میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ خدانخواستہ اسے خناق یا نمونیہ تو نہیں ہو گیا۔ بیمار پڑ جائے تو ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے ہچکچاتا ہوں۔ کہیں وہ مہلک یا خطرناک بیماری دریافت نہ کر لے۔

اس نے جب سے چلنا پھرنا سیکھا ہے مجھے گلیوں اور محلوں میں سائیکلیں دوڑانے اور سکوٹر اور کاریں بھگانے والے کھٹکنے لگے ہیں مجھے یہ سوچ کر ہول آتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد جب وہ سکول جانے لگا تو اسے سڑکیں پار کرتے ہوئے کتنی ہی موٹر سائیکلوں اور تیز رفتار گاڑیوں سے بچنا ہو گا اور اس کی سلامتی کیسے کیسے غفلت شعار اور رفتار کے نشے میں چور ڈرائیوروں کے رحم و کرم پر ہو گی۔

گلی محلے میں کوئی اجنبی شخص نظر آ جائے تو مجھے اس پر بردہ فروش ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ ہم نے کاشی کو سخت تاکید کی ہوئی ہے کہ وہ گھر سے باہر کسی آدمی پر اعتبار نہ کرے اور کھلونا یا کھانے پینے کی چیز ہرگز قبول نہ کرے اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ وہ گم ہو جائے یا کھو جائے تو اسے والدین کے نام اور گھر کا پتہ یاد ہو۔ ہم نے باتوں باتوں میں یہ معلومات ذہن نشین کرا دی ہیں۔ ایک روز وہ گلی میں کھیل رہا تھا اس کی امی باورچی خانے سے نکل کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے ایک نظر دیکھ لیتی تھی کہ اچانک وہ بھاگتا ہوا اندر آیا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا اور اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی امی نے پوچھا۔

''کیا ہوا بیٹے؟''

کہنے لگا''امی۔۔۔۔۔۔آدمی''

اس کی امی نے بھاگ کر دروازہ بند کرلیا کیونکہ وہ آدمی اس کے پیچھے پیچھے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا مگر اسی لمحے باہر سے آواز سنائی دی۔

''بیٹی! میں اختر علی ہوں۔۔۔۔۔۔وادھر سے گزر رہا تھا کہ کاشی کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا' میں اسے پیار کرنا چاہتا تھا مگر وہ ڈر کر اندر بھاگ آیا۔ آپ لوگوں نے آدمیوں سے اسے قدر خوفزدہ کیوں کر رکھا ہے؟''

پچھلے دنوں سابقہ تلخ تجربوں کی بنیاد پر بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ کاشی کے نرسری کلاس میں داخلہ کی بروقت رجسٹریشن کروا لینی چاہیے تاکہ بعد میں دشواری نہ ہو۔ میں نظریاتی طور پر انگلش میڈیم تعلیم کے خلاف ہوں۔ اپنی قومی زبان سے محبت کرتا اور انگریزی زبان کی بالادستی کے خلاف تقریریں کرتا رہتا ہوں لیکن کاشی کے لئے میں نے انگلش میڈیم سکول میں داخلہ کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ مجھے اس سے محبت ہے اور میں اسے اپنی طرح ناکامیوں اور احساس کمتری کا شکار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے نرسری کلاس میں اس کے داخلہ کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں ان سے پتہ چلا کہ اس کو جنوری اور جون کے درمیان کسی وقت پیدا ہونا چاہیے تھا جبکہ وہ ۱۴ اگست کو پیدا ہو گیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ایک جھوٹا برتھ سرٹیفکیٹ بنوایا جائے اور اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز اور بنیاد ہی جھوٹ پر استوار ہو۔

میں ہر تعلیم یافتہ شخص کی جھوٹ کو نظریاتی طور پر ناپسند کرتا ہوں مگر کیا کیا جائے مجھے کاشی کا مستقبل بہت عزیز ہے۔ ویسے بھی جہاں تک سرٹیفکیٹ کا تعلق ہے میں اسے معمول کا ایک حصہ خیال کرتا ہوں دفتری امور میں ہر بات پر سرٹیفکیٹ مانگا جاتا ہے اگر ہم سچ اور جھوٹ کے چکر میں پڑے رہیں تو دفتری امور تو ایک طرف تنخواہ' اوور ٹائم اور ٹی اے ڈی اے کچھ بھی وصول نہ ہو مثلاً مجھے ایک سو روپے ماہوار سواری الاؤنس یہ سرٹیفکیٹ دینے پر ملتا ہے کہ میں نے کم از کم تین سو میل سفر سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لئے کیا ہے۔ اگر میں نے یہ سر دو سو ننانوے میل کیا ہو اور سچ بولتے ہوئے اس کا اندراج بھی اسی طرح کر دوں تو مجھے ایک پیسہ تک نہیں مل سکتا۔ اب کون کتنا احمق ہے جو اتنا بے ضرر سا جھوٹ نہ بول کر مہنگائی کے اس زمانے میں پورے ایک سو روپے کا نقصان کر بیٹھے۔ سچی بات یہ ہے کہ غیر فطری قوانین اور ضابطے بنا کر بددیانتوں اور مجرموں کی ایک پوری نسل پیدا کی جا سکتی ہے۔

آپ بیشک مستطیل یا مربع کے اضلاع پر سڑکیں اور فٹ پاتھ بنوا دیں مگر جیومیٹری اور ریاضی سے نابلد شخص بھی وتر کے مقام پر

شارٹ کٹ خود تلاش کر لیتا ہے۔

میں نے کاشی کے کیریئر کے بارے میں بھی سوچا ہے اگرچہ میرا جی یہی چاہتا ہے کہ اسے ایسی تعلیم دلاؤں اور اس کے لئے ایسے مضامین کا انتخاب کروں جو اسے بہتر انسان بننے میں مدد دیں مگر میں نے اپنے مشاہدات کی روشنی میں فیصلہ کیا ہے کہ میں اسے تعلیم دلاؤں گا کہ وہ کچھ اور بنے یا نہ بنے معاشی اور اقتصادی طور پر بہر حال آسودہ حال انسان ہو۔

کاشی کی وجہ سے گھر کا ماحول ہی نہیں بدلا میرا مزاج اور بہت سی عادتیں بھی تبدیل ہو گئی ہیں۔ میں رات کو اکثر دیر سے گھر آنے کا عادی تھا مگر اب زیادہ تر وقت گھر پر گزارتا ہوں گھر کے دوسرے افراد کی طرح میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ کاشی کو خوش رکھا جائے اور اس کے سامنے چیخ یا چلا کر بات نہ کی جائے' گالی نہ بکی جائے' الزام تراشیاں نہ کی جاتیں' جھوٹ نہ بولا جائے' بات بے بات سرزنش کر کے اس کی انا اور تشخص کو مجروح نہ کیا جائے اور اس پر بلاوجہ پابندیاں لگا کر اس کے دل میں نفرت کا بیج نہ بویا جائے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ کاشی نے میری ہمت اور حوصلے کو پست کر دیا ہے۔ اس سے پہلے اگر میرا نا اہل اور بدمزاج باس بلاوجہ مجھ پر بگڑتا یا میرے ساتھ ناانصافی کرتا تھا تو میں اس کے منہ پر فائل مار دینے کا حوصلہ رکھتا تھا مگر اب خاموش رہنے کو جہاد سمجھتا ہوں۔ میں نے مصالحت اور مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور اپنے بہت سے نظریات میں لچک پیدا کر لی ہے اور یہ سب کچھ میں نے کاشی کی وجہ سے کیا ہے۔ میرا خیال ہے میں اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔ اگر اس کے گلے پر چھری رکھ کر مجھے کسی ناکردہ گناہ کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا جائے تو میں اس کے گلے پر چھری نہیں چلنے دوں گا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ کتنے عظیم اور غیر معمولی انسان تھے جو اپنے بیٹوں کو حق کی راہ میں قربان کر دینے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتے تھے۔ میں نے خود سے کئی بار سوال کیا ہے کہ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں مگر مجھے بڑے سے بڑے آدرش کے لئے بھی اپنی طرف سے خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ملا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کاشی سے بڑھ کر میرا کوئی آدرش نہیں ہے مجھے اپنی اس خود غرضی اور بزدلی پر ندامت ہے مجھے اپنے جرم کا احساس ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ میں اکیلا نہیں اپنے اپنے کاشی سے محبت کرنے والے بہت سے اور لوگ بھی اسی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اسی کی سزا پا رہے ہیں۔



کنٹوپ

گاڑی نہایت آہستہ چل رہی تھی۔ بار بار رک جاتی تھی۔ بعض اوقات اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا کہ چل رہی ہے یا رکی کھڑی ہے۔ کبھی کبھی لگتا انجن زور لگا رہا ہے مگر گاڑی اس سے کھینچی نہیں جا رہی۔

اس نے پریشان ہو کر پھولوں کی طرف دیکھا۔ ان پر پژمردگی بھنبھنانے لگی تھی ایک آدھ پھول نے مرجھا کر پنکھڑیوں کا تاج اتار پھینکا تھا اور گردن ایک طرف ڈال دی تھی اگر گاڑی اسی رفتار سے چلتی رہی اور بار بار رکتی رہی تو اس کے سارے پھول مرجھا کر رہ جائیں گے اس نے دکھ سے سوچا۔

وہ...... یہ پھول اس کے لیے لے کر جا رہا تھا جس کی آنکھیں نرگسی تھیں۔ مگر اس نے نرگس کے پھول نہیں دیکھے تھے رواں سال نرگس والا شعر پڑھا تھا۔ اگر یہ پھول مرجھا گئے تو وہ بالکل خالی ہاتھ رہ جائے گا۔ اس کے پاس اس کے لیے اور کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اسے دکاندار کی بات یاد آ گئی۔

"بابو جی...... اگر آپ ان کو دھوپ' دھوئیں اور حبس سے بچا کر رکھیں گے اور گلدان کا پانی بدلتے رہیں گے تو یہ منزل تک پہنچنے تک بالکل تازہ رہیں گے۔"

اس نے پوری احتیاط کی تھی۔ ہر طرح سے ان کا خیال رکھا تھا مگر پتہ نہیں موسم کا اثر تھا یا انجن کے دھوئیں کی وجہ سے وہ بہت جلد مرجھانے لگے تھے حالانکہ ابھی اس نے آدھا سفر بھی طے نہیں کیا تھا۔

اس اسٹیشن پر جہاں سے اسے گاڑی تبدیل کرنا تھی پہنچ کر اس نے سوچا کیوں نہ وہ پھولوں کا نیا گلدستہ خرید لے۔ کیا پتہ دوسری گاڑی اسے بروقت منزل پر پہنچا دے اور وہ کھلے ہوئے مہکتے ہوئے تازہ پھولوں سمیت اس کے پاس پہنچ جائے۔ اس نے ایک مسافر سے جو اسی شہر کا رہنے والا تھا اور اپنا سامان اتار رہا تھا پوچھا۔

"یہاں نرگس کے پھول ملتے ہیں؟"

"کس کے پھول؟"

"نرگس کے"

''کیا یہ کسی خاتون کا نام ہے؟''

''خاتون کا نام بھی ہو سکتا ہے مگر میں پھولوں کی بات کر رہا ہوں''

''میں ان پھولوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا''

''کیا آپ نے وہ شعر نہیں سنا...... ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے''

''اچھا اچھا...... وہ والی نرگس'' مسافر نے جواب دیا پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد بولا

''میں نے خود تو یہ پھول کبھی نہیں خریدے مگر میرا خیال ہے ضرور مل جائیں گے''

پھر مسافر نے اسے دکان کا پتہ بتایا۔ دوسری گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر تھی وہ شکریہ ادا کر کے اور اپنا سامان حفاظت سے رکھوا کر باہر آیا اور ایک رکشہ میں سوار ہو کر چل دیا۔

راستے میں ایک جگہ...... ایک بہت بڑے میدان میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اس نے رکشہ والے سے پوچھا۔

''کیا یہاں کوئی میلہ لگا رہے؟''

''میلہ؟'' رکشہ والا عجیب سی ہنسی ہنس کر بولا ''ہاں بابو جی میلہ ہی سمجھو''

''میلہ ہی سمجھوں...... میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''ویسے یہاں کبھی میلہ بھی لگتا تھا۔ یہ اتنی بڑی بڑی دکانیں اور اسٹال لگتے تھے۔ طرح طرح کے کھیل تماشے ہوتے۔ جھولے پنگھوڑے' موت کا کنواں' جادو کے کھیل' سرکس اور تھیٹر' ہیر رانجھا' سوہنی مہینوال' اور سسی پنوں کے کھیل دکھائے جاتے۔ میرا صاحباں کا سوانگ رچایا جاتا۔ رنگ برنگی روشنیاں جھلمل جھلمل کرتیں۔ لاؤڈ اسپیکروں پر تیز موسیقی میں ماہیئے' ٹپے گائے جاتے' گانے والے اور والیاں لوگوں سے داد اور نوٹ وصول کرتے'' اس نے کچھ اور پوچھنا چاہا مگر پھر اسے اخبار میں پڑھی ہوئی ایک خبر یاد آ گئی اور وہ سہم کر چپ ہو رہا۔

ہجوم پیچھے رہ گیا تھا مگر اسے لگتا تھا جیسے اس کے پیچھے پیچھے ماتم کرتا آ رہا ہو یا پھر وہ خود اس ہجوم میں کھو گیا تھا...... پیچھے رہ گیا تھا۔ سینکڑوں میل پیچھے۔ جس بازار میں پھولوں کی دکان تھی وہاں یک طرفہ ٹریفک تھا۔ وہ بازار کے سرے پر اتر کر پیدل چلنے لگا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے ایک جگہ بہت سے لوگوں کو شور مچاتے' نعرے لگاتے اور بکرے بلاتے دیکھا۔ خوشی ابھی

اس شہر میں کہیں نہ کہیں موجود تھی یہ سوچ کر وہ بہت خوش ہوا۔ شاید کشتیاں ہو رہی تھیں۔ اسے کشتی بہت پسند تھی پہلوانوں کو اکھاڑے میں اترتے اور ایک دوسرے کے پنجے میں پنجہ ڈال کر زور آزمائی کرتے دیکھ کر اس کا اپنے اوپر اعتماد بڑھ جاتا تھا فخر سے سینہ تن جاتا تھا۔

وہ آگے بڑھا۔ مگر وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ وہاں بٹیر لڑائے جا رہے تھے۔ لڑانے سے پہلے شاید انہیں کافی عرصہ تک بھوکا رکھا گیا تھا۔ مایوس ہو کر وہ پلٹ آیا اور پھولوں کی دکان تلاش کرنے لگا۔

واپسی پر وہ بڑے میدان کے قریب سے پھر گزرا۔ اس نے دیکھا سب لوگ میدان کے وسطی حصے کی طرف آنکھیں پھاڑ دیکھ رہے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں وہ ایک دوسرے کی اوٹ میں خوفزدہ نظروں سے ایک ہی سمت میں دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے عورتوں اور بچوں کو سسکتے اور چیخیں مارتے سنا۔ اسے چھوٹے ماموں یاد آگئے۔

ایک بار چھوٹے ماموں کا چِتا مرغ پڑوس والے نانبائیوں کے مرغ سے ہار گیا تھا تو چھوٹے ماموں نے دو دن تک کھانا نہیں کھایا تھا پھر تیسرے دن جب وہ سکول سے لوٹا تو اسے پتہ چلا کہ چھوٹے ماموں کافی دیر سے چھت پر چڑھتے ہوئے تھے۔ وہ اپنی پتنگ لے کر چھت پر آیا۔ مگر وہاں اس نے عجیب منظر دیکھا۔ وہ چھوٹے ماموں کی ہمیشہ عزت کرتا تھا مگر اس روز کے بعد اسے ان سے سخت نفرت ہوگئی۔ چھوٹے ماموں نے نانبائیوں کے کالے مرغے کو دونوں ہاتھوں سے مظبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور ان کا چِتا مرغ اس کی گردن اور کلغی پر بے رحمی سے چونچیں مار رہا تھا۔

وہ جلدی جلدی اسٹیشن کی طرف چلنے لگا لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے چھوٹے ماموں کا چِتا مرغ اس کی ننگی پیٹھ پر اپنی نوکیلی چونچوں سے سوراخ کر رہا ہو۔ اس کی روح نجانے کہاں رہ گئی تھی شاید ہزاروں لاکھوں لوگوں کے درمیان گھری رہ گئی تھی۔ اکیلی، بے بس ذلت وتحقیر کی کیچڑ میں لت پت۔

جب وہ اسٹیشن پر پہنچا گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سامان رکھوایا اور سوار ہو گیا۔ مگر اس کا ذہن اب تک الجھا ہوا تھا۔ اس نے باہر کے منظر میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اسے سب کچھ پھیکا پھیکا اور اداس اداس لگ رہا تھا۔ یہ گاڑی بھی پہلی گاڑی کی طرح بار بار رک جاتی تھی اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ چل رہی ہے یا رک گئی ہے اسے ایسا لگ رہا تھا کہ آٹھ دس بوگیوں والی اس ریل گاڑی کے آگے انجن کی جگہ وہ خود جتا ہوا ہے اور ریل گاڑی اس سے کھینچی نہیں جا رہی۔

سفر کے پہلے مرحلے میں وہ کتنا خوش، مطمئن اور پر امید تھا۔ اس کا قد دو گز ہی تھا مگر اسے نو گز لگتا تھا مگر اب وہ سکڑ کر اپنے اصلی قد سے بھی آدھا رہ گیا تھا۔ ہمسفروں کے چہروں سے اپنائیت اور اعتماد غائب ہو چکا تھا اور حالانکہ اب اس کے پاس تازہ پھولوں کا

گلدستہ موجود تھا مگر اس کا دل مرجھا سا گیا تھا۔

اسی لمحے آدمی جتنا بڑا ایک چوہا اندر آ گیا۔ اس کا سر چھوٹا اور پچکا ہوا تھا۔

''پیسہ دے''

اسے یاد آیا...... اس نے کسی ملک کے بارے میں پڑھا تھا جہاں چھوٹے پاؤں خوبصورتی کی علامت سمجھے جاتے تھے اور انہیں چھوٹا رکھنے کے لیے بچوں کو لوہے کے جوتے پہنا دیئے جاتے تھے۔

کیا پتہ اس نے سوچا ہمارے ہاں چھوٹے اور پچکے ہوئے سروں اور نابالغ ذہنوں کو اپنی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہو اس لیے بچوں کو پیدا ہوتے ہی لوہے کے کنٹوپ پہنا دیئے جاتے ہیں۔

چوہے کی گردن پر اس کے گائیڈ کی گرفت تھی۔ اس کے ہاتھ میں کشکول تھا' کشکول میں پیسے تھے

''پیسہ دے''

''تمہارا کنٹوپ کہاں ہے؟''

''پیسہ دے''

اور تمہارا کنٹوپ؟ اس کے اندر کسی نے سرگوشی کی

''میں نے اتار کر رکھ دیا ہے''

''نہیں...... تم جھوٹ کہتے ہو...... تم نے اب تک پہن رکھا ہے۔ سب نے پہن رکھے ہیں طرح طرح کے کنٹوپ۔ تعصب اور تنگ نظری کے۔ جہالت کے۔ خود غرضی کے۔ ان کے اتارنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اجازت دینے والوں نے خود پہن رکھے ہیں۔ اسی لیے میرا' تمہارا...... ہم سب کے سر چھوٹے رہ گئے ہیں۔ اسی لیے ہم کوتاہ ہمت ہیں۔''

بوگیاں ایک دوسری کی کمر میں ہاتھ ڈالے انجن کے پیچھے گھسٹتی ہیں۔

چوہے کے کشکول میں سکے کھنکتے ہیں۔

دبوچی ہوئی گردن اسٹیئرنگ کی طرح ادھر ادھر گھومتی ہے۔ اس کے تالو میں فٹ چھوٹی سی مشین سے آواز سنائی دیتی ہے۔

''پیسہ دے''

اسے خانو یاد آ گیا۔

سارے لڑکے ایک دوسرے کی کمر پر ہاتھ رکھے کھلے میدان میں اس کے پیچھے بھاگتے

''چھک چھک چھک''

''لالہ موسیٰ چھ چھ پیسے۔ لالہ موسیٰ چھ چھ پیسے''

پھر خانو کے باپ کے غصے اور نفرت کے زہر میں بجھی آواز تیر کی طرح سنناتی ہوئی آتی اور اس کے سینے میں پیوست ہو جاتی۔

''اوئے حرام زادے ادھر آ''

اور ساری ریل گاڑی پٹڑی سے اتر جاتی۔ انجن کی کوک اس کے حلق میں پھنس جاتی اور وہ گاڑی سے علیحدہ ہو کر اس طرح کو جدھر سے آواز آتی بھاگ جاتا۔...... بوگیاں کچھ دیر انجن کا انتظار کرتیں پھر اس کے پٹنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر سہم جاتیں اور اپنے اپنے گھروں کو بھاگ جاتیں۔

خانو کا باپ بہت غصیلا اور بدمزاج تھا اور اس کا سچ مچ خیال تھا کہ وہ اس کا اپنا بیٹا نہیں تھا۔

کانو کبڈی کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ اس کا قد اور سانس لمبا اور چھاتی بے حد چوڑی تھی اپنے ہم عمروں میں وہ دور سے پہچانا جاتا مگر جب اس کے باپ کے آواز سنائی دیتی وہ سکڑ کر چوہا سا بن جاتا۔

''پیسہ دے'' چوہے نے اسے پھر چونکایا۔

''پیسہ دے پیسہ دے'' بوگیوں کے پہیئے پٹڑی کے جوڑوں پر سے گزرتے ہوئے اس کی نقلیں اتارنے لگے۔

اس کے دل پر چھوٹے ماموں کے چتے مرغ نے پھر ٹھونگا مارا۔ پتہ نہیں وہ کون تھا اب کس حال میں تھا۔ شاید وہ ہسپتال کے بستر پر اوندھے منہ پڑا کراہ رہا ہو۔

''ایک روپے کا سوال ہے بابا''

''تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا؟''

''ایک روپے کا سوال''

''کیا مشین میں آ کر کٹ گیا تھا؟''

''نہیں۔۔۔۔۔ جی۔ ایک روپے کا''

''ویلنے میں آ گیا تھا؟''

''نہیں''

''چکی میں؟''

''نہیں ایک روپے کا سوال''

''کیا اس پر کوڑھ اگ آیا تھا' کھکھر پھوڑا نکل آیا تھا؟''

''ایک روپے کا سوال''

ایک دن اس نے خانو سے پوچھا۔

''تمہیں اپنے باپ کے مرنے کا افسوس تو ہوا ہوگا۔''

''ہاں'' اس نے جواب دیا۔''کیونکہ وہ سچ مچ میرا باپ تھا اور''

''اور کیا؟''

''اور میں نے خود اسے ہلاک کر دیا۔''

''تم نے ۔۔۔۔۔۔ اپنے باپ کو؟''

''ہاں ۔۔۔۔۔ ا۔گھر میں سب روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتے تھے مگر میں اس کا کھانا جو گھر میں علیحدہ پکتا تھا اور بہت لذیذ ہوتا تھا موقع پا کر چکھ لیتا تھا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس طرح وہ میرے زہر سے آہستہ آہستہ مرتا چلا جائے گا۔''

چھوٹے ماموں کا چتا مرغ اس کے ذہن میں پر پھڑ پھڑاتا اور غرور سے تنی ہوئی گردن کو خم دے کر پورے زور سے بانگ دیتا ہے۔ وہ چونک جاتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا ہے اور ریل گاڑی عین جنگل کے درمیان رکی کھڑی ہے۔ اس نے گھبرا کر پھولوں کو ٹٹولا' وہ مرجھا چکے تھے اور ان سے مری ہوئی مچھلیوں کی سڑاند آ رہی تھی۔

''انجن خراب ہو گیا ہے۔'' ساتھ والے نے اسے اطلاع دی۔

''اب کیا ہوگا؟''

''اب دوسرا انجن آئے گا۔ اس وقت تک ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔''

وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔



دھوپ دھوپ دھوپ

ایک رات اس کا باپ دیر تک گھر نہ لوٹا۔ مگر پھر بستی کے سب سے اونچے مکان کی چھت سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

''لوگو۔۔۔۔۔۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بستی وقت سے پیچھے نہ رہ جائے تو انصاف قائم کرو۔ انصاف ہی نیکی اور راست بازی ہے اور تم ظلم اور ناانصافی کرنے والے ہاتھوں کو پہچانو اور انہیں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہ دو ورنہ تمہارا شمار ظالموں میں سے ہوگا۔''

اس کا باپ گھر لوٹا اور اطمینان سے سو گیا۔

خلاف معمول ہوا چل رہی تھی اسے بھی نیند آ گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی صبح کاذب کا وقت تھا۔۔۔۔۔۔ ہوا بند تھی اور اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے کروٹ بدلی اور ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اس کے باپ کا سر اس کی گردن سے الگ پڑا ہوا تھا۔

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں مگر کسی نے اس کے گھر میں جھانک کر نہ دیکھا۔ اس نے بقایا رات روتے اور بین کرتے گزاری۔

اس کا خیال تھا کہ آج صبح نہیں ہوگی مگر وہ حیران ہوا مرغ نے اسی طرح اذان دی جیسے ہر روز دیتا تھا اسی طرح پو پھٹی اور صبح ہوئی اور ہر روز کی طرح چڑیاں چہچہائیں' کوے منڈیروں پر آ بیٹھے اور مشرقی افق پر شفق نمودار ہوئی۔

اس کا خیال تھا کہ آج اسے بھوک نہیں ستائے گی اور پیاس نہیں لگے گی مگر اسے وہی کتا بھوک لگی اور پیاس نے ستایا۔ اس نے روٹی کے ٹکڑے کے لئے پاؤں چاٹتے کتے کو بار بار دھتکارا مگر وہ تھوڑی دور جا کر پلٹ آتا اور دم ہلاتے ار پاؤں چاٹنے لگتا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ دن عام دنوں جیسا نہیں تھا مگر اسے سب کچھ معمول کے مطابق نظر آیا سوائے اس کے کہ جب دھوپ نکلی تو وہ غیر معمولی تیز اور سرخ تھی۔ اتنی سرخ کہ ساری چیزیں لہولہان معلوم ہوتی تھیں اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر سرخ رنگ کی

چمکیلی دھند چھائی ہوئی تھی اور سورج کسی خونخوار درندے کی طرح جبڑوں سے لگا خون چاٹتا جھپٹتا چلا آتا تھا۔

اس کا اندازہ تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ جوق در جوق اس سے تعزیت کرنے آئیں گے۔ اس کے باپ کی بے وقت اور دردناک موت پر اظہار افسوس کریں گے اور اسے صبر کرنے کی تلقین کریں گے۔ مگر وہ یہ جان کر حیران ہوا کہ کسی نے بھول کر بھی اس کی خبر نہ لی۔

اس کا خیال یہ بھی تھا کہ وہ گزشتہ رات کے انتباہ کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھے سہمے ہوئے بیٹھے رہیں گے اور اس وقت تک انہیں کوئی آہٹ نہیں چونکا سکے گی جب تک انہیں انصاف اور نیکی کا یقین نہ دلا دیا جائے مگر جب منشیوں' فورمینوں اور ٹائم کیپروں نے حاضریوں کے رجسٹر کھولے اور ان کے نام پکارے تو ہر طرف سے حاضر جناب کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور اسے محسوس ہوا کہ وہ بستی میں اکیلا رہ گیا ہے۔

وہ بے حد پریشان ہوا۔ وہ اکیلا کیا کرے' کفن دفن کا انتظام کیسے کرے' کسی کا میت کے پاس رہنا ضروری تھا اور ابھی بہت سے کام تھے۔ قبر کھدوانا تھی۔ کفن خریدنا اور سلانا تھا۔ میت کو غسل دینا اور جنازہ پڑھنا تھا اور جنازہ اٹھانے کے لئے کم از کم چار آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر وہ سب کام پر چلے گئے تھے۔ پوری بستی مردوں سے خالی پڑی تھی اور عورتیں اور بچے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سہ پہر تک ان کی واپسی کا انتظار کرے اس کے سینے میں جتنی آہیں اور آنکھوں میں جتنے آنسو تھے وہ نچھاور کر چکا تھا اور اب خالی ذہن لئے میت کے پاس بیٹھا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اچانک اسے خیال آیا کہ اگر وہ واپسی پر بھی اس کی مدد کو نہ آئے تو؟۔۔۔۔۔ کیوں نہ وہ بھی کام پر چلا جائے۔ پوری دیہاڑی میت کے پاس بیٹھ کر ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ ۔۔۔۔۔ اور اب تو اسے پیسوں کی اور بھی زیادہ ضرورت تھی۔ اس طرح واپسی پر وہ کچھ لوگوں کو ساتھ لیتا آئے گا اور سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے کفن دفن کا انتظام ہو جائے گا۔ جونہی اس نے کام کے بارے میں سوچا۔ منشی کی آواز اسے گھر بیٹھے سنائی دینے لگی اور کوئی اس کے اندر حاضر جناب' حاضر جناب پکارنے لگا۔

اسے پتہ ہی نہ چلا کب اس نے مرے ہوئے باپ کی چارپائی گھسیٹ کر اندر کی' کب جوتا پہنا اور کب کام پر حاضر ہو گیا۔

منشی نے اسے دیکھتے ہی قہقہہ لگایا پھر ڈانٹ پلائی اور بولا۔ ''آج پھر ماتم ہو گیا؟''

''ہاں جی''

''یقیناً آج پھر تمہارا باپ قتل ہو گیا ہو گا۔''

''ہاں جی''

''رات اس نے پھر وہی کیا ہو گا؟''

''ہاں جی''

''اچھا یہ بتاؤ۔۔۔۔۔۔قاتل کا کچھ پتہ چلا؟''

''نہیں جی''

''تمہیں کسی پر شک ہے؟''

''ہاں۔۔۔۔۔میرا خیال ہے اس نے خود ہی اپنے آپ کو قتل کر دیا۔''

''بیوقوف''منشی نے ہنستے ہوئے کہا''اسے خودکشی کہتے ہیں۔''

''خودکشی نہیں جی۔۔۔۔۔۔قتل''

''اچھا اچھا۔۔۔۔۔۔قتل ہی سہی۔۔۔۔۔۔یہ بتاؤ کہ آج بھی اسے دفن کر کے آئے ہو یا نہیں؟''

''نہیں جی''

''چلو شام کو دفنا لینا۔۔۔۔۔۔تم اچھا کرتے ہو دیہاڑی ضائع نہیں کرتے۔میں تمہاری حاضری لگا دیتا ہوں مگر پھر لیٹ نہ آنا' آئندہ محتاط رہنا۔''

''جی میرا ایک ہی باپ تھا۔''

''بیوقوف''منشی کو بے طرح ہنسی آ گئی' کہنے لگا۔''باپ تو ایک ہی ہوتا ہے۔''پھر ہنسی روک کر بولا''لیکن نہیں...... شاید تم ٹھیک کہتے ہو ایک سے زیادہ باپ بھی ہو سکتے ہیں۔اچھا تم کام کرو لیکن یاد رکھو تمہیں چھٹی کے بعد کام کر کے لیٹ آنے کی کمی پوری کرنا ہوگی۔''

''اچھا جی''

کام کرتے کرتے ہر روز کی طرح دوپہر ہو گئی لو چلنے لگی اور آسمان سے آگ سی برسنے لگی۔اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔آسمان اب بھی سرخ تھا اور دھوپ غیر معمولی تیز تھی۔راج مچان پر بیٹھے اینٹوں سے چنائی کر رہے تھے وہ مچان پر کھڑے اپنے ساتھی کی طرف اینٹیں پھینکنے لگا جو انہیں پکڑ پکڑ کر مچان پر راجوں کے استعمال کے لئے جمع کرتا جاتا۔دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی اور وہ تازہ دم تھا۔اینٹیں پکڑنے کے لئے ایک کی بجائے دو آدمیوں کو مچان پر کھڑے ہونا پڑا۔

سورج اب عین سر پر آ گیا تھا۔اب کھانے کی چھٹی ہو جانی چاہیے تھی مگر ٹھیکیدار کے منشیوں نے شاید آج بھی اپنی گھڑیاں وقت سے پیچھے کی ہوئی تھیں آج بھی بارہ بجنے کے باوجود بارہ نہیں بج رہے تھے۔دوپہر ہو گئی تھی مگر اس کا اعلان نہیں ہوا تھا۔وہ سوچنے لگا

کتنی دلچسپ بات ہے کہ اعلان نہ ہو تو خواہ سورج سر پر آ جائے دوپہر نہیں ہو سکتی اور گھڑیاں پیچھے کر لی جائیں تو وقت رک جاتا ہے۔
اسے اپنے باپ کی باتیں بے معنی معلوم ہونے لگیں۔
''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری بستی وقت سے پیچھے نہ رہ جائے تو انصاف قائم کرو۔''
پھر اسے یاد آیا کہ دیہاڑی پوری کرنے کے بعد اسے گھر پہنچنا اور کفن دفن کا انتظام کرنا ہے۔اس کے باپ کی اکیلی میت گھر میں پڑی ہے اسے افسوس ہونے لگا۔اسے باپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے اس نے خود ہی سوچا۔۔۔۔۔
آدمی زیادہ سے زیادہ مر سکتا یا قتل ہو سکتا ہے اس کے بعد کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟
اور شاید ابھی وقفے کا اعلان نہ ہوتا اگر اینٹیں ختم نہ ہو جاتیں اس نے روٹی کی خوشبو سونگھ کر پاؤں چاٹنے والے کتے کو ایک بار پھر دھتکارا مگر وہ دم ہلانے اور اس کے پاؤں چاٹنے لگا۔اسے دل ہی دل میں ندامت ہو رہی تھی کہ اسے آج بھی بھوک لگی ہے آج۔۔۔۔۔جب اس کا باپ قتل ہو گیا ہے اور ابھی اس کی لاش بے گور و کفن گھر میں پڑی ہے۔اس نے دوسروں سے نظر بچا کر قریبی کنٹین پر کھانا کھایا۔کھانا ختم ہو گیا تھا مگر اس کی بھوک آج بھی ختم نہ ہوئی تھی۔اس نے ہر روز کی طرح پانی سے کھانے کی کمی پوری کی اور قریبی سائٹ آفس کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگ کر دوپہر ڈھلنے اور وسل بجنے کا انتظار کرنے لگا۔سایہ اب سمٹتے سمٹتے دیوار کے ساتھ آ لگا تھا۔اس نے ٹانگیں اور سمیٹ لیں مگر تھوڑی ہی دیر میں دھوپ اور پھیل گئی اب دھوپ اور دیوار کے درمیان اس کے لئے گنجائش نہیں تھی وہ کہیں سایہ تلاش کرنا چاہتا تھا مگر اسی لمحے اینٹوں سے بھرے ہوئے بہت سے ٹرکوں کا شور سنائی دیا اور ساتھ ہی وقفہ ختم ہونے کی وسل سنائی دی شاید انہوں نے اپنی گھڑیاں آگے کر لی تھیں یا وہ خود بخود وقت سے آگے نکل گئی تھیں۔
دوبارہ کام پر آتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف دیکھا آسمان دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔سورج کسی آتش فشاں کی طرح مسلسل آگ اگل رہا تھا اور شکر دوپہر سروں پر تنی ہوئی تھی لو کے تھپیڑے اپنی پیاسی زبانوں سے حسن اور ہریالی چاٹ رہے تھے اور ہر طرف دھوپ کے لہریئے سانپوں کی بارش ہو رہی تھی۔وہ سب بے سایہ دیواروں کی اوٹ سے نکل کر کام پر واپس آ گئے تھے۔سب کے چہرے جھلسے ہوئے اور جسم نڈھال تھے۔روٹی کھانے اور پانی پینے کے باوجود تازگی کا کوئی پھول ان کے چہروں پر نہیں کھلا تھا اسے ان پر ترس آنے لگا۔روٹی کھانے اور پانی پینے کے بعد وہ خود تازہ دم ہو گیا تھا حالانکہ آج اس کا باپ قتل ہو گیا تھا اور اسے اس کی بے وقت اور دردناک موت کا صدمہ تھا۔
دیوار اب پہلے کی نسبت بلند ہو گئی تھی مگر اس کی اوپر پھینکی ہوئی اینٹیں پکڑنے اور انہیں راجوں کے قریب رکھنے کے لئے اب بھی دو آدمی مچان پر کھڑے تھے۔مسلسل اینٹیں پھینکتے پھینکتے اس کے بازو شل ہو گئے اور کمر دکھنے لگی تو مچان اسے ایک آدمی نیچے اتر آیا اور

میت کے کہنے پر کدال لے کر مٹی کھودنے لگا۔

کام کرتے کرتے اس نے وقت کا اندازہ لگانے کے لئے قدموں میں سائے کو تلاش کرنا چاہا تو وہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سایہ کہیں نہیں تھا اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اوپر دیکھا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی دیر بعد بھی سورج کی ٹکیا ایک ہی جگہ پر عین سر کے اوپر ٹھہری ہوئی تھی اور ڈھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی شاید اس کا باپ ٹھیک ہی کہتا تھا اس نے سوچا وقت رک گیا تھا مگر کیوں؟

اب وہ بہت تھک گیا تھا اور دیوار کے ساتھ ساتھ مچان بھی اور اونچی ہو گئی تھی وہ اینٹ اٹھا کر مچان کی طرف پھینکتا تو وہ واپس آ جاتی اور اسے اپنا سر بچانا مشکل ہو جاتا۔ مچان پر کھڑے ہوئے آدمی کا قہقہہ سنائی دیتا اور وہ دوسری اینٹ پھینکنے کے لئے پورا زور لگاتا۔

دوپہر ڈھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی مگر منشیوں نے سب کو پوری یا نصف دیہاڑی کی اجرت دے کر رخصت کر دیا تھا اب وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ صبح دیر سے کام پر آیا تھا اور ابھی تو اس کی نصف دیہاڑی بھی مکمل نہیں ہوئی تھی اسے مٹی کھودنے پر لگا دیا گیا۔

کام کرتے کرتے اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی اور حیران ہوا۔ مسلسل دھوپ اور شدید گرمی کی وجہ سے درختوں کے پتے جھڑ گئے تھے اور وہ بے سایہ ہو گئے تھے۔ چلچلاتی دھوپ دیواریں پھاند کر سائٹ آفس' سٹور اور زیر تعمیر عمارت کے اندر گھسنے لگی تھی۔ اسے اپنے باپ کی میت کا خیال آیا وہ آتی بار اس کی چارپائی گھسیٹ کر اندر کر آیا تھا لیکن کیا پتہ اس نے سوچا دھوپ برآمدے کی راہ کمرے میں گھس گئی ہو۔ مگر اسے کم از کم اپنی نصف دیہاڑی ضرور مکمل کر لینی چاہیے اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ جب وہ کام کرتے کرتے نڈھال ہو گیا اور اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے تو منشی نے اسے آدھی دیہاڑی دے کر گھر جانے کی اجازت دے دی۔

وہ بستی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا۔ بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے تھے اور ان کے بال دھوپ میں سفید ہو گئے تھے۔ گھروں کے اندر دھوپ گھس آئی تھی اور وہ گھبرا کر باہر آ گئے تھے مگر کہیں سایہ نہیں تھا۔ شاید بستی وقت سے پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ لوگوں کو مدد کے لئے بلانے سے پہلے ایک نظر میت کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔ وہ جلدی جلدی گھر پہنچا مگر یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ وہ چارپائی جس پر اس کے باپ کی لاش تھی' خالی پڑی ہوئی تھی ـ ـ ـ ـ ـ ـ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔



ننگا پیڑ

وہ اپنے زمانے کے نامی ہوئے حکیم تھے ان کا دور دور تک شہرہ تھا اور ان کے مطب کے سامنے ہر وقت مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ انہوں نے نہ صرف دیسی طب کی بہت سی کتابیں پڑھی تھیں بلکہ ان کی نظر طبی میدان میں ہونے والے نئے عالمی تجربات اور تحقیق پر بھی خاصی تھی کیونکہ وہ شہر سے جدید طبی سائنس پڑھ کر لوٹے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اطبا کو علاج کے لیے زیادہ سے زیادہ ملکی وسائل اور مقامی جڑی بوٹیوں پر انحصار کرنا چاہیے کیونکہ وہ لوگوں کے مزاج کے زیادہ قریب ہوتی ہیں اور نسبتاً کم ناخوشگوار اثرات چھوڑتی ہیں ان کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاں بڑی قیمتی جڑی بوٹیاں ہیں جن کو تلاش کرنا اور ان پر تحقیق کرنا نہایت ضروری ہے۔ حکیم صاحب کا ایک اصول یہ تھا کہ وہ جب تک کسی دوا یا جڑی بوٹی کو خود آزمانہ لیتے تھے ان کے افعال وخواص کا خود مطالعہ اور تجربہ نہیں کر لیتے تھے مریضوں کو استعمال نہیں کراتے تھے چنانچہ ان کے اہل خانہ ان کی اس عادت سے اکثر پریشانی میں مبتلا رہتے کیونکہ وہ زہریلی اور تندو تیز مزاج کی جڑی بوٹیاں چکھ کر یا کھا کر خود بیمار پڑ جاتے تھے اور اس وقت تک دوسری کوئی دوا استعمال کر کے اچھا ہونا بھی نہیں چاہتے تھے جب تک متعلقہ جڑی بوٹی یا دوا کے تمام خواص مزاج و افعال' کیفیات اور علامات اپنے بیٹوں کو قلمبند نہیں کرا لیتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کسی درخت کے تلخ اور سخت قسم کے تخم کھائے تو ان کے بدن میں اینٹھن اور تشنج پیدا ہو گیا۔ اعضا شکنی ہونے لگی۔ کمر اور ہاتھ پاؤں میں درد ہونے لگا۔ چہرہ نیلگوں پڑ گیا آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔ جبڑے کے عضلات میں بھی تشنج ہونے لگا اور سارے گھر اور گاؤں بھر میں خوف و دہشت طاری ہو گئی۔ دونوں بیٹوں نے علامات اور کیفیات قلمبند کر لی تھیں چنانچہ حکیم صاحب کی طرف سے پہلے سے دی گئی ہدایات کے مطابق انہیں قے کرائی گئی اور تریاق دوائیں استعمال کرائی گئیں جب جا کر ان کی حالت سنبھلی۔

بعد میں حکیم صاحب ان تلخ اور سمی تخموں کو بدبر کر کے نہایت اعتماد سے اپنے مریضوں کو استعمال کراتے رہے اور کامیابی سے امراض عصبانیہ وبلغمیہ اور ضعف اعصاب واعضائے رئیسہ کا علاج کرتے رہے۔

حکیم صاحب نے سینکڑوں نباتی' حیوانی اور جمادی ادویہ مفردہ کی ماہیت' مزاج' افعال اور خواص اپنے ذاتی تجربوں اور تحقیق سے معلوم کیے اور انہیں اپنی بیاض میں قلمبند کر لیا تا کہ اپنے بیٹوں اور آنے والی نسلوں کے کام آئیں اور عام لوگوں کو ان کے نسخوں

سے شفاء کاملہ نصیب ہوتی رہے۔ حکیم صاحب اپنے دونوں بیٹوں کو سارا علم اور حکمت سکھانا چاہتے تھے مگر وہ پڑیاں بنانے اور لوگوں سے دام وصول کرنے میں لگے رہتے اور پڑھنے لکھنے اور سیکھنے کی طرف کم توجہ دیتے۔ حکیم صاحب کا معمول تھا کہ ہفتہ عشرہ بعد قریبی پہاڑوں کی طرف نکل جاتے اور دشوار گزار جنگلوں میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتے رہتے پھر گھر آ کر ان نئی دواؤں پر طرح طرح کے تجربات کرتے۔

ایک دفعہ حکیم صاحب پہاڑوں اور جنگلوں سے جڑی بوٹیاں تلاش کرنے کے بعد لوٹے تو ایک عجیب خبر لائے انہوں نے بتایا کہ ایک دشوار گزار راستے پر انہوں نے ایک ایسا قیمتی اور بابرکت پودا دیکھا ہے جو دنیا میں بہت کمیاب ہے اور جس کی انہیں برسوں سے تلاش تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگرچہ اس پودے کو بڑھنے اور درخت بننے میں ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے لیکن جب ایک بار تناور درخت بن جائے اور اس پر پھل آنا شروع ہو جائے تو یہ نہایت قیمتی کارآمد اور برکت والا درخت ہوتا ہے۔ حکیم صاحب اگرچہ سائنس اور جدید علوم سے بہرہ ور تھے مگر روحانی قدروں پر ان کا پختہ یقین تھا اور ان کا کہنا تھا کہ اس درخت کی موجودگی اور اس کا سایہ خوش قسمتی کی علامت ہے اس کا پھل نہایت شریں اور لذیذ ہوتا ہے بھوک اور پیاس کا غلبہ نہیں ہوتا اعصاب کو قوت ملتی ہے اور حاملہ عورتیں اس پھل کو کھائیں تو ان کے بطن سے صحت مند اور خوبصورت بچے جنم لیتے ہیں حکیم صاحب نے یہ بھی کہا کہ اس کے سائے میں بیٹھنے سے جسم میں توانائی اور دل و دماغ میں فرحت و سکون پیدا ہوگا اور امراض عامہ و امراض خبیثہ کا دفعیہ ہوگا۔

حکیم صاحب سے اس بابرکت درخت کی تعریفیں سن کر تمام اہل خانہ بے تاب ہو گئے اور اسے دیکھنے اور جلد از جلد کھود کر گھر لے آنے کا اصرار کرنے لگے مگر حکیم صاحب نے بتایا کہ اس درخت کو کھود کر گھر لانے سے پہلے اس کے لیے مناسب موسم، مٹی اور جگہ کا انتخاب ضروری ہے۔ چنانچہ ان کی حویلی کے صحن کے عین وسط میں ان کی ہدایت کے مطابق ایک گڑھا کھودا گیا انہوں نے مٹی کا اچھی طرح سے معائنہ کیا ہاتھوں میں لے کر اسے دیکھا اور سونگھا اور نہایت خوش ہو کر کہا۔

''ہاں وہی مٹی ہے۔ بالکل ویسی ہی۔ خوب پھلے پھولے گا''

اہل خانہ یہ سن کر نہایت خوش ہوئے اور زیادہ بے تابی کا مظاہرہ کرنے لگے مگر حکیم صاحب نے انہیں موسم تبدیل ہونے تک انتظار کرنے کو کہا۔

بہار کے آغاز کے ساتھ ہی ایک دن حکیم صاحب نے روانگی کا اعلان کر دیا۔ ان کے بیٹے اور پوتے بھی ان کے ہمراہ تھے سب کے پاس کسیاں، کلہاڑیاں اور کدالیں تھیں اور ایک بہت بڑا ٹوکرا بھی جس میں گاچی سمیت درخت کو جو ابھی پودے کی صورت میں تھا

کھود کر لانا تھا۔

وہ سب لوگ راستے کی صعوبتیں اٹھاتے' خاردار جھاڑیوں اور نوکیلے پتھروں سے زخمی ہوتے بھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال ہوتے حکیم صاحب کی رہنمائی میں دشوار گزار جنگل عبور کرتے گئے اور آخر کار اس بابرکت پودے کو کھود کر گھر لے آئے۔

بیٹوں اور پوتوں کا کہنا تھا کہ وہ درخت واقعی بڑا بابرکت تھا کیونکہ اس کے پاس پہنچتے ہی راستے کی ساری تھکن خود بخود اتر گئی تھی۔ خاردار جھاڑیوں سے زخمی ہونے والے جسموں میں درد کی ٹیسیں رک گئی تھیں اور کسی انجانی قوت کے زیر اثر دلوں میں ولولہ اور خود اعتمادی کے جذبات موجزن ہو گئے تھے۔

جونہی وہ لوگ واپس آئے اہل خانہ خوشی سے کھل اٹھے اس رات حویلی میں گھی کے چراغ جلائے گئے...... اور گاؤں بھر کے بچوں میں مٹھائی تقسیم کی گئی حکیم صاحب نے اسی وقت دوبارہ گڑھا کھودا بھربھری مٹی میں اپنے ہاتھوں سے پودے کی گاچی لگائی اور اسے پانی دیا۔ پھر سرکنڈوں کی باڑھ چاروں طرف لگا دی تاکہ مویشیوں اور اندھیرے میں جلنے والوں سے تازہ تازہ لگا ہوا پودا محفوظ رہے۔ حکیم صاحب نے پودا لگا کر ہاتھ منہ دھوتے ہوئے کہا۔

''اگرچہ زمین نہایت زرخیز اور آب و ہوا مناسب اور اچھی ہے لیکن جب تک پودا اپنی جڑیں اچھی طرح سے نہیں پکڑ لیتا اور نئی شاخیں نہیں نکال لیتا نہایت احتیاط اور خبر گیری کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ یوں تو اس درخت کے پتے' چھال' لکڑی اور پھول سب ہی کچھ نہایت کارآمد ہے اور ان سے بعض امراض میں عارضی اور وقتی سکون حاصل ہوسکتا ہے مگر اس سے متوقع مستقل طبی اور روحانی فوائد اسی وقت حاصل کیے جا سکتے ہیں جب یہ پھیل کر تناور درخت بن جائے اور اس پر پھل آنے لگے۔

حکیم صاحب جب تک زندہ رہے خود صبح سویرے اٹھ کر پانی دیتے' سہ پہر کو مطب سے نکل کر گوڈی کرتے۔ کیاری میں کھاد ڈالتے' سرکنڈوں کی باڑھ ٹھیک کرتے اور ایک ایک پتے اور ٹہنی کا خیال اور حساب رکھتے مگر ابھی بمشکل پودے نے جڑیں پکڑی تھیں اور ایک آدھ نئی کونپل پھوٹی تھی کہ ایک روز کسی جڑی بوٹی کی اپنے اوپر آزمائش کرتے ہوئے حکیم صاحب کی حالت بگڑ گئی انہیں بر وقت تریاقی دوا نہ دی جا سکی اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔

حکیم صاحب کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک دونوں بھائی مل جل کر رہتے رہے اور ایک ساتھ پودے کی دیکھ بھال اور مطب کرتے رہے مگر پھر ان میں مطب کی آمدنی کی تقسیم پر اکثر جھگڑا ہونے لگا۔ جس کے نتیجے میں دونوں نے الگ الگ مطب قائم کر لیے۔ وہ دونوں روپیہ کمانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے لیکن دونوں نیم حکیم تھے تاہم جلد ہی بڑے بھائی کو یاد

آیا کہ عارضی سکون کے لیے بعض امراض میں اس درخت کی پتیاں استعمال کی جاسکتی ہیں چنانچہ اس نے پتوں سے اپنے مریضوں کا علاج شروع کردیا۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ سرعت اور تیز رفتاری کا آغاز تھا لوگ وقتی سکون سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے تھے۔ بڑے بھائی نے خوب دولت کمائی اور اس کا شہرہ دور دور تک ہوگیا۔

چوتھے بھائی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے وہ دن رات پریشان رہتا لوگ کہتے تھے کہ اس کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے۔ وہ کامیابی کے لیے دن رات ہاتھ پاؤں مارتا رہتا مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ آخر ایک روز ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھ کر اسے پانے بھائی کی کامیابی کا راز معلوم ہوا اور اس نے بھی چھال اتار کر بطور دوا استعمال کی اور اسے بے حد حیرت ہوئی جب اس کا مریض بھی عارضی طور پر سہی مگر صحت یاب ہوگیا۔

پتے اور چھال ختم ہوگئے تو انہوں نے اس کی ٹہنیاں کاٹ کر اور پیس کر آزمائیں اور انہیں بھی امراض شکم میں سکون بخش اور منفعت بخش پایا۔ چنانچہ دونوں ایک دوسرے سے چوری اس کی ٹہنیاں اور لکڑی کاٹتے اور دواؤں میں شامل کرنے لگے۔

دوا کی پڑیوں میں ایک جیسی لکڑیاں چباتے اور برادہ پھانکتے پھانکتے مریضوں کو شک گزرا تو ایک رات کچھ لوگ آئے اور باقی ماندہ پودے کو جڑوں سمیت اکھاڑ کر لے گئے اور انہوں نے اسے سکھا کر اور پیس کر برابر تقسیم کرلیا۔ لیکن اگلی بہار میں گھر والے یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ پر کیے ہوئے گڑھے کی جگہ پر ایک ویسا ہی درخت آگ آیا ہے شاید کوئی زندہ جڑ باقی رہ گئی تھی!!!



بڑا سوال

اس نے اپنے ذہن کی لیبارٹری میں پہلے بھی بڑی بڑی باتیں دریافت کی تھیں مگر اس بار انکشاف کی جو نئی کونپل کھلی تھی وہ نہایت ہی غیر معمولی نوعیت کی تھی۔

ہر بار جب وہ کوئی نئی بات دریافت کرتا تھا اسے بے پناہ خوشی ہوتی تھی مگر اس بار ایسا نہیں ہوا...... اس انکشاف نے اسے پریشان اور مضطرب کر دیا۔ اسے لگا اس نے ایک بڑی چٹان کے نیچے سے مٹی کھود ڈالی ہے اور اب چٹان اسے ہاتھوں پر روکنا پڑ گئی ہے۔

اپنی حماقت پر اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا آخر اسے ایسا تجربہ کرنے کی کیا ضرورت تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا...... چٹان اپنی جگہ سے سرک چکی تھی۔ بجلی کے سے کوندے نے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مستور منظر کی جھلک دکھا دی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور جو کچھ معلوم ہو چکا تھا وہ واپس لاعلمی کے دریا میں نہیں پھینکا جا سکتا تھا۔

کچھ روز ملول اور پریشان رہنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر ایک نئی خواہش کا چیونٹا کلبلانے لگا ہے کہ وہ یہ حیرت انگیز نظر جس کو اس کی آنکھیں دیکھ چکی تھیں سب کو دکھائے اور داد پائے۔ مگر یہ آسان اور سہل نہیں تھا۔ لوگ نئے خیالات کو آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ اسے تمام مشکلات کا بخوبی اندازہ تھا مگر اس کے اندر یہ خواہش کہ وہ سب کو اس حیرت انگیز دریافت سے آگاہ کرے شدت اختیار کرتی گئی۔

ایک بار جب شہر میں ایک بہت بڑا جلسہ ہو رہا تھا اس کا جی چاہا وہ اچانک اسٹیج پر پہنچ کر ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دے مگر اول تو اس کا اسٹیج تک پہنچنا ہی مشکل تھا دوسرا لوگوں کے مشتعل ہو جانے کا ڈر تھا۔ خطرات کا سامنا کرنے کے لیے وہ تیار تھا مگر اس طرح اس کا اصل مقصد ادھورا رہ جاتا۔

پھر ایک بار کسی رشتہ دار کی شادی کے موقع پر جب بہت سے لوگ ایک جگہ جمع تھے اس کا جی چاہا وہ اعلان کر دے۔ مگر پھر وہ یہ سوچ کر رشتہ دار پہلے ہی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے وہ اس کی بات پر یقین کرنے کی بجائے اسے غلط معنی پہنانے کی کوشش کریں گے خاموش رہا۔

اخر کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اس کام کی ابتدا اپنے گھر سے کرنی چاہیے اور اپنی بیوی کی اعتماد میں لینا چاہیے۔ اس کی بیوی پڑھی لکھی اور ذہین عورت تھی اور اگر چہ وہ بھی اس کے بارے میں کوئی زیادہ اچھی رائے نہیں رکھتی ہو گی ...... مگر وہ ایک روایتی بیوی کی طرح اس کی وفادار ضرور تھی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی بات سن کر حیت سے اچھل پڑے گی مگر اس نے نہایت اطمینان سے اس کی بات سنی اور جب وہ کہہ چکا تو وہ اسی اطمینان سے اٹھی اور باورچی خانے میں جا کر آٹا گوندھنے لگی۔

وہ پریشان ضرور ہوا مگر پھر اسے خیال آیا کہ اتنی بڑی بات سن کر اسے ہضم کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے کچھ وقت تو لگتا ہے۔ اس لیے اسے مہلت دینی چاہیے یقیناً وہ اس پر غور کرے گی اور جلد ہی نہایت حوصلہ افزا ردعمل ظاہر کرے گی۔

مگر جب کئی روز گزر گئے تو اسے تشویش ہونے لگی کیا معلوم وہ اس کی بات سمجھی ہی نہ ہو؟

آخر ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا "میں نے تم سے جو بات کی تھی اس کا تم نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا؟"

"کیا جواب دیتی" وہ بولی "آپ تو ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں سوچتے ہیں۔ کچھ گھر کی بھی فکر ہے؟"

"کیوں کیا ہوا گھر کو؟"

"گھر میں آلو پیاز ختم ہو گئے ہیں۔ ڈپو سے آٹا منگانا ہے۔ ماموں جان کی نظر کا امتحان کرانا اور خالہ جان کو افسوس کا خط لکھنا ہے۔ کئی دن سے کہہ رہی ہوں کہ منی کے یونیفارم کا کپڑا لا دیں میں خود سی دوں گی لیکن آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب سے میری سینڈل ٹوٹ چکی ہے۔"

بیوی سے مایوس ہو کر اس نے اپنے قریبی دوست ن سے رجوع کیا۔ ن نے اس کی گفتگو نہایت توجہ اور دلچسپی سے سنی مگر کوئی جواب دینے کی بجائے اسے پکڑ کر نئی فلم دکھانے لے گیا۔ فلم کے دوران اس نے ن کو یاد دلایا کہ اس نے اس سے بہت ہی اہم بات کی تھی۔ اس پر ن نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ وہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا اور اس کا علاج کرائے گا۔

ایک ایک کر کے اس نے سبھی دوستوں سے بات کی مگر کسی نے بھی اس کی بات توجہ اور سنجیدگی سے نہیں سنی۔

دوستوں سے مایوس ہو کر وہ گھر میں پناہ گزین ہوا اور کئی روز تک کتابیں پڑھتا اور مختلف قسم کے چھوٹے موٹے تجربے کر کے وقت گزارتا رہا۔ ایک صبح اس کی بیوی چائے لے کر آئی تو وہ خلاف معمول مہربان اور خوش نظر آتی تھی۔ اس کے دل میں امید کا پھول کھلا۔

''معلوم ہوتا ہے میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہے؟''

''کونسی بات؟''

''وہی جو میں نے بہت دن پہلے تم سے کی تھی''

''حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا'' وہ اطمینان سے بولی

''یہی تو میں کہتا ہوں'' اس نے خوش ہو کر کہا

''حقیقت وہ نہیں جو آپ سوچتے ہیں''

اس پر اداسی ہی پڑ گئی۔ دل بجھ گیا۔ درشت لہجے میں بولا

''تمہارے پاس اپنی بات کا کیا ثبوت ہے؟''

''میرے پاس اپنی کسی بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ مجھے اپنی کوئی بات کسی لیبارٹری میں جا کر ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ بس جو کچھ جیسا ہے' ٹھیک ہے۔''

''مجھے تمہاری ذہانت پر ہمیشہ فخر رہا'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا ''اور میری یہ خواہش ہے کہ تم میری بات پر غور کرو ...... اس سے میرا حوصلہ بڑے گا کہ کم از کم میری شریک حیات تو میری ہم خیال ہے۔''

''میں آپ کی بات پر کیسے یقین کرلوں'' وہ رکھائی سے بولی ''کیا میں آپ کو جانتی نہیں ہوں؟''

''تم مجھے ضرور جانتی ہو'' اس نے کہا ''میری اچھائیوں اور برائیوں سے واقف ہو' مجھ میں بہت سی خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن میں جس سلسلے میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں وہ میرا ذاتی مسئلہ نہیں ہے''

''آپ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے'' وہ تنک کر بولی اور اٹھ کر چلی گئی اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

دو ایک دن اور گزر گئے۔ وہ اس سے کھنچا کھنچا سا رہا مگر اس نے ذرا پرواہ نہ کی' معمول کے مطابق گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ آخر تیسرے چوتھے روز اس نے خود ہی بات شروع کی۔

''پھر تم نے کچھ مزید سوچا؟''

''نہیں مجھے فرصت نہیں ہے''

پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد خود ہی کہنے لگی ''میرا مشورہ ہے آپ ایسی باتیں سوچنا چھوڑ دیں یہ نہایت اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے

اس کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں'' اس نے کہا ''مگر میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ ہاں تم میرا ساتھ دو تو میرا کام آسان ہو سکتا ہے۔ محلے کی عورتیں تمہیں اچھا سمجھتی ہیں۔''

''جی نہیں مجھے تو معاف ہی رکھیے۔''

''اچھا مدد نہیں کرنا چاہتیں نہ کرو...... مگر یہ تو بتاؤ کہ تم میری بات پر یقین کرتی ہو؟''

''نہیں''

''مگر کیوں''

''اس لیے کہ جس شخص کو اتنا یاد نہ رہتا ہو کہ اس نے رات کیا کھایا تھا اور جسے یہ یاد نہ ہو کہ اس کی بیوی نے جو ساڑھی پہنی ہوئی ہے وہ اسے کسی اور نے تحفے میں نہیں دی بلکہ اس کے اپنے شوہر نے خود خرید کر دی تھی تو ایسے شخص کو اتنی بڑی اور دور کی باتوں کا پتہ کیسے چل سکتا ہے؟''

''بڑی بڑی باتیں سوچنے والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی فروگذاشتیں ہو جاتی ہیں۔''

''لیکن میں نے دیکھا ہے'' وہ بولی ''آپ کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سوچتے ہیں''

''ہاں...... وہ بھی سوچ لیتا ہوں...... تم ہر بات میں میری ذات کو کیوں درمیان میں گھسیٹ لاتی ہو...... آخر تم کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ میں گمنام اور عام سی موت نہیں مرنا چاہتا...... میں نے جو کچھ دریافت کیا ہے وہ نہایت اہم ہے اور میں اسے دنیا تک پہنچانا چاہتا ہوں خواہ اس کے لیے مجھے بڑی سے بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔''

''مجھے افسوس ہے'' وہ دھیمے لہجے میں بولی ''میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گی''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''ہاں''

بیوی کی باتوں سے ایک بار پھر مایوس ہو کر...... وہ کئی روز تک اداس رہا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا...... کہ اگر وہ اپنی شریک حیات اور قریبی دوستوں کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکا تو دوسرے لوگوں کو کیسے قائل کرے گا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے باپ سے بات کرے گا۔ اگرچہ اس کے باپ کے عقائد اور نظریات بہت پختہ تھے مگر وہ علمی باتوں کو سمجھنے اور پرکھنے

کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے۔ کم از کم وہ اسے بہتر مشورہ ضرور دیں گے۔

اس نے اپنے باپ کی نظر کا معائنہ کرایا اور انہیں نئے نمبر کی عینک خرید کر دی گئی روز ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور طرح طرح کے موضوعات پر بحثیں کرتا رہا پھر ایک روز ڈرتے ڈرتے اس نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔

وہ نہایت اطمینان سے سنتے رہے پھر بولے۔

''برخوردار...... جب تم ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے تو میں نے اس وقت سے لے کر آج تک کئی بار تمہیں الٹی سیدھی کتابیں پڑھنے اور بے معنی باتوں پر سوچتے رہنے سے منع کیا مگر تم باز نہ آئے...... اب ماشاء اللہ تم ایک ذمہ دار شوہر اور باپ ہو اب تو تمہیں ایسی واہیات باتوں کے بارے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

''ابا جی'' اس نے پریشان ہو کر کہا ''یہ واہیات باتیں نہیں ہیں۔ یہ اتنا اہم اور بڑا مسئلہ ہے کہ اگر سب لوگ میری طرح سوچنے لگ جائیں تو ایک بہت بڑی تبدیلی آسکتی ہے۔''

''میرا مشورہ ہے'' اس کے باپ نے کہا'' تم ایسی باتوں پر سوچنا چھوڑ دو آخر تمہیں اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔''

''فائدہ؟''

''ہاں...... الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور تمہارا سکون الگ چھن جائے گا۔''

''سکون تو اب بھی چھن گیا ہے ابا جی۔ اور میں اتنی بڑی بات کیسے چھپا سکتا ہوں۔ کیسے خاموش رہ سکتا ہوں میں انسانی تاریخ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

''تم بالکل فکر نہ کرو...... انسانی تاریخ کو اپنے فطری ارتقاء کی منزلیں طے کرنی ہیں اور وہ کرتی رہے گی...... تم کاروباری معاملات پر توجہ دیا کرو۔''

باپ کی گفتگو سے دل برداشتہ ہو کر اس نے ایک علام دین کا سہارا لیا اور اسے اور زیادہ مایوسی ہوئی جب انہوں نے بتایا کہ اس مسئلے کے بارے میں کتابوں میں کہیں ذکر نہیں آیا...... اور یہ کہ ایسی باتوں پر سوچنا گناہ ہے۔

اب اس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے خیالات کو مضمون کی شکل میں اخبار کو بھیج دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن ایک روز ڈاک سے اسے اپنا مضمون واپس مل گیا۔ ایڈیٹر نے لکھا تھا۔

''قواعد ہمیں ایسے مضامین کی اشاعت کی اجازت نہیں دیتے' ویسے بھی آپ کی تحریر میں پختگی نہیں ہے آپ مشق جاری رکھیں

گے تو بہتر زبان لکھنے لگیں گے۔''

اس نے چاہا کہ وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کی خواہش کا گلا گھونٹ کر کوئی دوسرا کام جو اس کے گھریلو اور کاروباری معملات کو بہتر بنانے میں مدد دے شروع کر دے اور اس نے ایسا ہی کیا مگر اس کے بعد اس کی اپنی زندگی ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

اب وہ کئی برسوں سے مجذوبیت کی حالت میں شہر کی سڑکوں پر گھومتا پھرتا ہے کوئی کچھ دے دیتا ہے تو کھا لیتا ہے۔ جہاں جی چاہتا ہے پڑ کر سو رہتا ہے۔ ہاں اسے سکول کے بچوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ چھٹی کے وقت وہ کسی نہ کسی سکول کے گیٹ پر پہنچ جاتا ہے اور ایک ایک بچے کو غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ بچے اس پر آوازے کستے اور اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھتے ہیں۔

''سی اے ٹی؟''

''کیٹ''

''آر اے ٹی؟''

''ریٹ''

''چھ دونی؟''

''بارہ''

بچے اپنے سوالوں کے درست جواب سن کر خوش ہوتے ہیں مگر وہ اداس ہو جاتا ہے شاید وہ کسی بڑے سوال کے پوچھے جانے کا منتظر ہے۔



آدم بو

جب سے ساتھ والے گاؤں میں نوجوان مولوی منظور درس گاہ سے فارغ التحصیل ہو کر آیا ہے مولی اللہ رکھا کی راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔

اور اگرچہ ان کے شاگرد نائب اور خدام ان کی ہمت بڑھاتے اور اس کل کے چھوکرے کام کو ٹھپ دینے کی یقین دہانیاں کراتے ہیں لیکن انہیں اپنا ستارہ گردش میں نظر آتا ہے اور اگرچہ مولی منظور نے ابھی تک ان کے خلاف زبان نہیں کھولی مگر انہیں یقین ہے کہ وہ اس کے لیے زمین ہموار کر رہا ہے اور مناسب موقع پا کر ضرور ان سے اپنے باپ کا بدلہ لے گا جس کے خلاف انہوں نے فتوی دے کر اسے بڑی مسجد سے بے دخل کرایا تھا۔ ویسے بھی نوجوان مولوی جس قسم کے خیالات کا پرچار کر رہا ہے اور جس طرح عام لوگوں اور کم کاریوں میں مقبول ہوتا جا رہا ہے وہ ان کے لیے کسی بڑے خطرے کی علامت ہے۔ انہیں اپنے برسوں کے تجربے اور سرکردہ لوگوں سے گہرے تعلقات کی وجہ سے اعتماد ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ سوچ کر ہول آتا ہے کہ پتہ نہیں نوجوان مولوی درسگاہ سے کیا کیا نئی باتیں سیکھ کر اور کسی سانچے میں ڈھل کر آ گیا ہو اور اسے علم کا جو جن چمٹا ہوا ہے وہ کب تک اسے چمٹا رہے اور اب تو اس نے اپنے واعظ میں تاریخ، جغرافیے اور کتی سائنس کی باتیں بھی شامل کرنا شروع کر دی ہیں۔

مولوی اللہ رکھا کے احباب اور خیر خواہوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ وقتی اور ہنگامی ہے جونہی نوجوان مولوی کے پاؤں زمین پکڑیں گے وہ اپنے آپ میں آ جائے گا مگر مولوی اللہ رکھا کی تشفی نہیں ہوتی انہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ خود ایک بار پھر سے پیدا ہو کر اپنے مقابلے پر نکلے ہیں اور سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے۔

برسوں پہلے کی بات ہے۔

مولوی احمد دین کا پہلی بیوی سے ایک ہی لڑکا تھا۔ سوتیلی ماں کی گالیوں اور بدسلوکیوں سے عاجز آ کر وہ قصے کہانیوں میں پناہ لیتا لیکن پھر یہی قصے اور کہانیاں اس کے لیے عذاب الیم بن گئیں۔

گاؤں میں داخل ہونے یا باہر جانے کے لیے ایک ہی بڑا راستہ تھا اس راستے پر ایک بدصورت دیو ہر وقت بیٹھا آدم بو، آدم بو پکارتا رہتا تھا۔ لوگ اسے بڑا ملک کہتے تھے وہ سچ مچ بہت بڑا تھا اس کے سامنے جا کر ہاتھی سکڑ کر چوہے اور چوہے پدی بن جاتے

تھے۔ وہ دو تہائی گاؤں کا مالک اور لمبے چوڑے خاندان کا سربراہ تھا۔ دیکھنے میں ہیبت ناک' باسی گوشت کا بہت بڑا تودہ...... اس کی آواز اس کی شکل وصورت کی طرح مکروہ اور خوفناک تھی اس کا جب اور جسے جی چاہتا بلوا لیتا۔ کمی کاری اور ان کے بچے اکثر بیگار میں پکڑے رہتے۔ کسی میں انکار کی جرات نہیں تھی۔ انکار کی صورت میں وہ نہایت فحش گالیاں دیتا اور جوتے مار مار کر شکل بگاڑ دیتا تھا۔

چوریوں' ڈاکوں' رسہ گیریوں' قتلوں اور مقدموں سے فراغت پا کر اب وہ سارا دن ڈیرے میں بیٹھا حقہ گڑگڑاتا اور کمی کاریوں سے پاؤں دبواتا مالش کراتا' چلمیں بھرواتا اور پنکھا جھلواتا رہتا تھا۔ اس کے ذمہ اس کی تفریح طبع کا کام تھا۔ پتہ نہیں اس کی سمجھ میں کچھ آتا تھا یا نہیں مگر وہ اکثر اس سے سوہنا وزینی کا قصہ سنتا تھا۔ اسے دوسرا کوئی قصہ یا کتاب پسند نہیں تھی اور سوہنا وزینی کا قصہ اس نے اسے اتنی بار سنایا تھا کہ اسے خود زبانی یاد ہوگیا تھا مگر بڑا ملک ہر دفعہ اتنی دلچسپی سے سنتا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار سن رہا ہو ...... وہ یہ قصہ سنا سنا کر تنگ آ گیا تھا اور انکار نہ کر سکنے کی اذیت میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ وہ بدبو جو اسے بڑے ملک کے جسم سے آتی تھی اب کتاب کے اوراق اور لفظوں سے آنے لگی۔ قصہ پڑھتے پڑھتے اس کا دماغ بدبو سے بھر جاتا اور اسے متلی آ جاتی' وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف کو بھاگ جاتا پھر فراغت پا کر دوڑتا ہوا آتا اور ایک کل کی طرح دوبارہ قصہ پڑھنے لگتا۔

کئی بار اس نے انکار کر دینا چاہا مگر بڑے ملک کا پیغام ملتے ہی وہ اپنے یا بڑے ملک کے مرجانے کی دعائیں مانگتا ہوں بھاگم بھاگ اس کے ڈیرے پر پہنچ جاتا اور اس وقت تک گلا پھاڑ پھاڑ کر قصہ گاتا رہتا جب تک کہ بڑا ملک خود ہی جمائیوں کے کئی گڑھے پھلانگ کر نیند کے کسی اندھے کنوئیں میں نہ گر جاتا۔

اس نے کئی بار اپنے باپ سے اپنی تکلیف اور خوف کا اظہار کیا تھا لیکن اس کا باپ بھی بے بس تھا اس نے کئی بار سوچا بڑے ملک کو قتل کر کے پھانسی لگ جائے مگر بڑے ملک کے سامنے جا کر اس کی گھگھی بندھ جاتی۔

پھر ایک روز وہ سوتیلی ماں کی بدسلوکیوں اور بڑے ملک کے جسم سے اٹھنے والی سڑاند سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ گیا اور سینکڑوں میل دور ایک دینی مدرسے کے درویش طالب علموں کی صف میں شامل ہوگیا۔

چند سال دینی' اخلاقی اور روحانی تعلیم حاصل کرنے اور درویشانہ زندگی گزارنے کی تربیت حاصل کر کے جب وہ درسگاہ سے نکلا تو اس کے سامنے زندگی کا بے حد وسیع میدان تھا وہ ایک عالم باعمل تھا اور اس کا سینہ تحت ہم اور غمگساری کے جذبات سے لبریز تھا ...... وہ گاؤں آیا تو بڑا ملک اپنے ڈیرے میں تخت پوش پر موجود نہیں تھا' اس نے صدق دل سے اس کے لیے مغفرت کی دعا کی لیکن

وہ گاؤں میں مستقل قیام نہ کرسکا اور دوبارہ عازم سفر ہوا۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا اور گاؤں کے ان لوگوں کے درمیان جن کے سامنے وہ بچپن میں ننگا پھرتا رہا تھا اور ان دوستوں اور ہم عمروں میں جن کے ساتھ تالابوں میں نہاتا' کبڈی کھیلتا' بیر توڑتا اور سوتیلی ماں سے مار کھاتا رہا تھا اسے اپنی بات منوانے اور اپنا مدعا بیان کرنے میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ اور وہ صرف اپنا مدعا بیان نہیں کرنا چاہتا تھا وہ بہت کچھ بدل دینا بہت کچھ تہہ و بالا کردینا چاہتا تھا۔

مولوی اللہ رکھا نے اس گاؤں میں آکر واقعی بہت کچھ بدل ڈالا۔ ان سے پہلے گاؤں کے نیم خواندہ امام مسجد نماز پڑھانے' بچے کے کان میں اذان دینے بھیڑ بکری ذبح کرنے اور جنازہ پڑھانے کا معاوضہ لیتے تھے ہر فصل کے موقع پر دوسرے کمی کاریوں کی طرح بوہل میں ان کا بھی حصہ ہوتا۔ عید بقر عید پر وہ مسجد میں کپڑا بچھا دیتے اور عید کی نماز پڑھانے کے عوض لوگوں سے غلہ اور نقدی وصول کرتے۔ نماز پڑھا کر وہ قربانی کے جانوروں کو ذبح کرتے اور پھر چھوٹی اور بڑی کھالوں کے بیوپار میں الجھے رہتے۔ ان کا حکم تھا کہ انڈہ کھانے کے لیے اس پر بھی تکبیر پڑھنا ضروری ہے کیونکہ اس میں بھی جان ہوتی ہے لوگ انہیں تین انڈوں پر تکبیر پڑھانے پر ایک انڈہ بطور معاوضہ دیتے کیونکہ صحیح طریقے سے تکبیر تو وہی پڑھ سکتے تھے۔ مگر مولی اللہ رکھا نے یہاں آکر ان سب قبیح رسموں اور روائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا' پرانے مولی صاحب لاکھ چیختے چلاتے رہے اور طرح طرح کے الزامات لگاتے اور کہتے رہے کہ وہ خلاف شرع باتیں بتاتا ہے مگر لوگ شریعت کی ان باتوں کو جلدی اور آسانی سے سمجھ لیتے ہیں جن میں ان کا فائدہ ہو چنانچہ مولوی اللہ رکھا کی کامیابی کی پتنگ اونچی اور اونچی اڑنے لگی اور پرانے مولوی صاحبان گاؤں سے ہجرت کرگئے یا انہوں نے اپنا آبائی کام چھوڑ کر کوئی دوسرا کام دھندہ شروع کردیا۔

مولوی اللہ رکھا نذر نیاز نہیں لیتے تھے۔ بڑے درویش صفت انسان تھے۔ مفت خوری سے سخت پرہیز کرتے اور خود کام کر کے اور کما کر اپنا پیٹ بھرتے وہ دن بھر اینٹیں ڈھوتے لائیاں کرتے' مویشی چراتے' بان کی رسیاں اور چارپائیاں بنتے...... اور بغیر کسی فیس یا معاوضے کے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے۔ لوگ ختم پڑھوانے کے لیے حلوے' کھیریں' سیویاں اور پراٹھے لاتے وہ ان کی دل شکنی کے ڈر سے ختم پڑھ دیتے مگر کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے' لوٹا دیتے یا کسی غریب یا بیوہ کے ہاں بھجوا دیتے۔ وہ مسجد کے حجرے میں رہتے تھے۔ خود مسجد میں جھاڑو دیتے صفائی کراتے' چراغ جلاتے' نمازیوں کے وضو کے لیے حوض میں پانی بھرتے اور نماز کا وقت ہوجاتا تو اذان دیتے۔ لوگ ان کی بے حد عزت کرتے اور ان سے محبت بھی۔ مگر جب وہ منبر پر کھڑے ہوتے تو ان کی آواز سے آس پاس کے گھروں کی دیواریں لرزنے لگتیں سننے والوں کے دلوں پر ہیبت طاری ہوجاتی۔ خدا کے سوا وہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے

اور حق بات ڈنکے کی چوٹ پر کہتے تھے۔

پھر انہوں نے کچھ عرصہ بعد ایک ایسی غریب بیوہ سے نکاح کر لیا جس کو اولاد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق ہو گئی تھی۔ مولوی صاحب سے نکاح کے بعد بی بی جی کے سوئے ہوئے نصیب جاگ اٹھے اور چند ہی برس میں گھر بچوں سے بھر گیا۔

مولوی صاحب ہمیشہ سے روکھی سوکھی کھا کر وقت گزارتے تھے۔ بی بی جی نے بھی ان کا بہت عرصہ تک ساتھ دیا اور عسرت اور فاقوں کی زندگی گزارنے پر بھی خدا کا شکر ادا کرتی رہیں مگر پھر بچوں کی وجہ سے مولوی صاحب سے چوری چھپے کھانے پینے کی کوئی چیز قبول کر لیتیں۔ مولوی صاحب کو پتہ چلا تو شروع شروع میں بہت خفا ہوئے مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ بچوں کو فاقوں مارنا اور ہر اچھی چیز کے لیے ترسانا مناسب نہیں ہے۔

پھر ایک بار ذیلدار کا چالیسواں تھا اس کے متمول بیٹوں نے چالیسویں کا غیر معمولی اہتمام کیا پوری برادری کو کھانے کی دعوت دی اور ختم کے موقع پر مولوی صاحب کے سارے کنبے کے کپڑے اور دنیا جہان کی نعمتیں، پھل اور میوے حاضر کیے۔ مولوی صاحب پریشان ہو گئے۔ ختم پڑھتے ہوئے ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کے پھٹے ہوئے کپڑے اور ترسی ہوئی صورتیں گھوم گئیں انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"میں کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا...... کسی کے ہاتھ سب چیزیں ہمارے گھر پہنچا دی جائیں"

مگر اب...... مولوی اللہ رکھا کی امامت کا دائرہ اپنی مسجد سے نکل کر آس پاس کے کئی ایک چھوٹے بڑے دیہات کی مسجدوں تک پھیل گیا ہے ان مسجدوں میں ان کے نائب امام آمدنی کے ایک تہائی حصے پر کام کرتے ہیں، وہ خود ہفتے میں ایک بار ہر مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں۔ انہوں نے نہایت محنت، مستقل مزاجی، دانائی اور اپنے زور خطابت کی وجہ سے ایک ایک کر کے ان مسجدوں پر قبضہ کیا ہے اور دیہات کے وڈیروں اور زمینداروں میں اپنے اثر ورسوخ اور رموز شریعت سے آگاہی کی بنا پر نیم خواندہ ملاؤں کو بے دخل کیا ہے ان کا شمار اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا ہے وہ ہر ایک کے کام آتے ہیں وہ ہاڑی ساؤنی کے کارے پر نہایت تھوڑے منافع پر بڑی بڑی رقمیں دے دیتے ہیں۔ زیور گروی رکھنے، فصل، زمین یا مویشی رہن رکھنے کے لیے لوگ انہی کے پاس آتے ہیں کہ وہ نہایت دیانتدار اور قابل اعتماد ہیں۔ کمی کاریوں نے ہی نہیں بڑے بڑے زمینداروں نے ان سے منافع پر موٹی موٹی رقمیں لے کر ٹیوب ویل لگوائے اور ٹریکٹر خرید دے ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنا پکا مکان بنا لیا ہے اور اس میں بجلی لگوالی ہے انہیں کسی سے کچھ مانگنے یا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی لوگ ہر چیز میں سے اللہ کا حصہ نکال کر خود ہی ان کو پہنچا جاتے ہیں۔

وہ بہت خوش اور اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے مگر جب سے نوجوان مولوی منظور درسگاہ سے لوٹا اور قریب والے گاؤں کی ایک مسجد سنبھال بیٹھا ہے ان کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔ مگر انہیں یہ سوچ کر قدرے اطمینان ہوتا ہے کہ لوگ کئی طرح سے ان کے محتاج ہیں اور پھر مولوی منظور کو ان کی طرح تعویذ گنڈا نہیں آتا بلکہ وہ اسے شرک سمجھتا ہے اور وہ محض امام مسجد ہی نہیں آس پاس کے دیہات کے واحد طبیب بھی ہیں اور با اثر لوگوں کے بہت سے اہم رازوں کے امین بھی......!

ہر جمعہ کی سام کو وہ مولوی منظور کے گاؤں سے آنے والی رپورٹ کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں ان کا کوئی خادم یا وفادار مولوی منظور کے جمعے کے وعظ میں شریک ہوتا ہے اور تمام حالات سے انہیں باخبر رکھتا ہے۔ مولوی منظور کے مقتدیوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور اب رمضان شریف کے پہلے جمعے کا انتظار ہے۔ رمضان شریف شروع ہوتے ہی مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد میں ایک دم غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے اور لوگ پند و نصائح اور وعظ و تلقین کی باتوں پر خصوصی توجہ دینے لگتے ہیں۔ اس پورے علاقے میں دو ہی جگہ جمعے کی نماز کے اجتماعات ہوں گے اور نمازیوں کی تعداد سے ان کے اور مولوی منظور کے درمیان ایک طرح کا فیصلہ ہو جائے گا۔

رمضان کے پہلے جمعہ کی شام کو ان کا ایک خادم پریشان حال لوٹتا ہے تو ان کا دل بیٹھ جاتا ہے۔ مولوی منظور کے مقتدیوں کی تعداد کسی طرح ان کے اپنے نمازیوں کی تعداد سے کم نہیں ہے...... انہیں اسی بات کا ڈر تھا۔ ان کا رنگ اڑ جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اس رات تراویح کی نماز پڑھاتے ہوئے انہیں ایک عرصہ بعد لقمہ ملتا ہے اور ابھی وہ لقمہ سے سنبھل نہیں پاتے کہ سجدہ سہو پڑ جاتا ہے۔

رات کو وہ تھکے اور نڈھال سے گھر لوٹتے ہیں اور دالان میں بچھی ہوئی بہت سی چھوٹی بڑی چار پائیوں کے قریب سے گزر کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر آتے ہیں۔ بی بی جی ان کی آہٹ سن کر لحہ بھر کے لیے جاگتی ہیں پھر خراٹے لینے لگتی ہیں۔ وہ اپنے سرہانے تپائی پر رکھا ٹھنڈے میٹھے دودھ کا گلاس اٹھاتے اور گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں۔ لیکن اچانک انہیں ایک جانی پہچانی مگر ناگوار سی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور جی متلانے لگتا ہے۔ وہ دودھ کا گلاس تپائی پر رکھ دیتے ہیں اور ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہیں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر بدبو کے بھبکے لپکتے چلے آتے ہیں۔ اچانک انہیں یاد آتا ہے کہ یہ بدبو ویسی ہی ہے جیسی بڑے ملک کے جسم سے اٹھتی تھی۔ وہ قے روکنے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر وہ نہیں رکتی۔



راتب

اسے یاد نہیں کہ پہلی بار اس کے دل میں اس سوال نے کب پر پھڑ پھڑائے کہ وہ...... اصل میں وہ نہیں کوئی اور ہے!

شاید ماں باپ کی سرد مہریوں نے آہستہ آہستہ اسے اس جان لیوا سوال کی بھٹی میں جھونکا یا شاید اپنے ہم عمروں کو اپنے اپنے والدین کے لاڈ پیار کی پینگیں جھولتے اور محبتیں ہنڈاتے دیکھ کر اس کے اندر محرومی کا کوئی سوما پھوٹا...... لیکن اسے یاد پڑتا ہے کہ بچپن میں پڑوس والی مائی حمیداں سے جو کہانی اس نے ایک بار سنی تھی شاید وہ اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے۔ اس کہانی میں ایک عورت اور بچے کا ذکر تھا۔ عورت صبح سویرے کھیتوں کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے نہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر ایک نوزائیدہ' بے لباس بچے کو دیکھا جو گھاس پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور اسے چیونٹے کھا رہے تھے۔ اس نے چھو کر دیکھا وہ زندہ تھا مگر اس قدر نحیف کہ چیونٹوں کے کاٹنے کی تکلیف پر اس کے منہ سے رونے کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی نہ اس میں حرکت کرنے کی سکت تھی۔ وہ کچھ دیر اسے خوف' حیرت اور پریشانی سے دیکھتی رہی پھر اسے اٹھا کر گھر لے آئی' گھر میں اس نے کبوتر' مرغیاں اور خرگوش پال رکھے تھے وہ اسے بھی پالنے لگی۔

اس نے مائی حمیداں سے کئی بار دریافت کیا کہ پھر کیا ہوا مگر وہ کہتی کہ کہانی اتنی ہی تھی اور اگر اور تھی بھی تو اسے یاد نہیں تھی۔

جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو اپنے گھر کے حالات دیکھ کر اسے خود ہی خیال آیا کہ کہانی میں جس بچے کا ذکر تھا وہ بچہ وہ خود ہے اور وہ عورت اس کی ماں تھی۔ اگر ایسا تھا تو اس کی ماں' اس کی اصلی ماں نہیں تھی اور وہ' وہ نہیں تھا۔ پھر کون تھا؟ اس سوال کے آگے برسوں لمبی چپ اور تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ اسے اس سوال کا جواب کبھی نہ مل سکا تاہم اس کے اندر ایک تجسس موجود رہا اور وہ چپکے چپکے اپنے اور اپنے والدین کی اصلیت کے بارے میں ٹوہ لگاتا رہا۔

پھر جب اسے پتہ چلا کہ وہ تین چار برس کا تھا تو اس کے والدین کسی دوسری جگہ سے آ کر اس گاؤں میں آباد ہوئے تھے تو اسے بالکل یقین ہو گیا کہ وہ اس کے اصلی ماں باپ نہیں تھے۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ اسے پتہ چل سکے کہ وہ کہاں سے اور کن حالات میں ہجرت کر کے آئے تھے مگر وہ کسی کو ٹھیک طرح سے نہیں بتاتے تھے۔

پھر جب اس کا باپ باؤلے کتے کے کاٹنے کی وجہ سے باؤلا ہو گیا اور گاؤں والوں نے اسے اس کے گھر کے اندر ستون سے

باندھ دیا اور وہ تماشائی لوگوں کو گالیاں دیتا اور رسیاں تڑوا کر ان پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے دل میں امید کا جگنو چمکا کہ شاید اب وہ اس کے اصلی ماں باپ کا نام اور پتہ بھی بتا دے مگر وہ اسے حرامی کہنے پر اکتفا کرتا۔

پھر جب اس کا باپ ستون سے ٹکریں مار مار کر اور رسیوں سے الجھ الجھ کر مر گیا تو اس کے ذہن میں امید کا ایک اور پھول کھلا کہ شاید گالیاں بکتی' کوسنے دیتی ماں کسی وقت غصے میں آ کر اس کے اصلی ماں باپ یا اگر وہ حرامی تھا تو اس کے اصلی باپ کا نام بتا دے گی مگر وہ کئی برسوں تک یونہی بکتی جھکتی رہی اور ایک روز بخار یا غصے میں پھنکتی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ تاہم اب بھی وہ ناامید نہیں ہوا تھا اس کا خیال تھا کہ اڑوس پڑوس اور گاؤں کے دوسرے لوگ جو شاید اس کے جھگڑالو ماں باپ کی وجہ سے اب تک خاموش تھے اب اسے ضرور بتا دیں گے کہ وہ اسے کہاں اور کیسے اٹھا لائے اور اصل میں وہ کس گھر کا چراغ تھا۔ مگر اسے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ ماں کے چالیسویں کے بعد بھی کسی نے اس قسم کی کوئی اطلاع فراہم نہ کی۔ بلکہ اس کے بے سہارا ہو جانے پر اظہار ہمدردی کرنے لگے۔ ہاں چودھرانی کا رویہ اور بہتر ہو گیا۔

وہ اور اس کی ماں حویلی میں کام کرتے تھے اس کا باپ ہمیشہ سے بیمار اور بیکار تھا اور زیادہ تر وقت چارپائی پر پڑا اور کھنگھارتا رہتا تھا لوگوں سے کم ملتا تھا' لوگ بھی اس سے ملنے سے کتراتے تھے ان کا خیال تھا وہ نشہ کرتا ہے کیا پتہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔

چودھرانی کی خواہش تھی کہ وہ بھی گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتا رہے مگر چودھری نے اسے مویشی چرانے پر مامور کر دیا اور اس کا سارا وقت چراگاہ میں گزر جاتا۔ ماں حویلی میں کام کر کے جلد گھر پہنچ جاتی مگر وہ چراگاہ سے مویشی لانے اور حویلی میں کھانا کھانے کے بعد چراغ جلے گھر پہنچتا۔ اور ماں باپ کے باہمی جھگڑوں اور لڑائیوں سے بے نیاز ہو کر رات بسر کر کے بعد چراغ جلے گھر پہنچتا۔ اور ماں باپ کے باہمی جھگڑوں اور لڑائیوں سے بے نیاز ہو کر رات بسر کر کے صبح سویرے ایک ساتھ ناشتہ کرنے اور کھانا کھانے کے لیے حویلی کا رخ کرتا۔ اپنے گھر میں اس کی حیثیت مسجد میں رات بسر کر کے اپنی راہ لینے والے مسافر کی تھی۔

جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس نے اپنے گھر آنے اور رات بسر کرنے کا سلسلہ کم کر دیا ویسے بھی اتنا تھکا ماندہ ہوتا کہ کھانا کھانے کے بعد اس میں گاؤں کے دوسرے سرے پر واقع اپنے گھر تک چل کر جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ کئی بار وہ اپنے گھر کے قریب آ کر ماں باپ کے باہم لڑنے کی آوازیں سن کر پلٹ جاتا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ ان سے ہر وقت آپس میں لڑنے کی وجہ دریافت کرے مگر اسے ہمت نہ ہوئی۔ اس کا باپ مسلسل بیمار رہ کر کافی کمزور ہو چکا تھا مگر جب کبھی اس کی پٹائی کرنے پر آتا تو اس میں پتہ نہیں اتنا زور کہاں سے آ جاتا تھا اور ماں لڑائی جھگڑے کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ بعض اوقات سوتے میں بھی کسی نہ کسی کو گالیاں اور بددعائیں دیتی

رہتی۔

اسے ماں باپ کے مرنے کا کچھ زیادہ افسوس نہیں تھا' وہ زندہ رہتے تو کیا ہو جاتا؟ ہاں ماں آخری دونوں میں اس کے بیاہ کا ذکر لے بیٹھتی تھی اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہتی تو کوئی اپنے جیسی عورت اس کے پلے باندھ دیتی اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح اس سے لڑتا جھگڑتا اور کسی دن باؤلا ہو کر گھر کے ستون سے ٹکریں مارتے مارتے مر جاتا۔

اسے اپنے باپ پر ترس ضرور آتا تھا لیکن اس خیال سے اسے اطمینان ہو جاتا کہ مر کر اس کی جان بہت سی پریشانیوں اور جھگڑوں سے چھوٹ گئی تھی۔

وہ روح اور جسم کے تعلق کے بارے میں باریک باتیں نہیں جانتا تھا اور اس سلسلے میں اس کی معلومات وہی تھیں جو اس کی مرحومہ ماں کی تھیں یا پھر گاؤں کی مسجد کے امام سے جو باتیں وقتاً فوقتاً اس نے لاؤڈ سپیکر پر سنی تھیں۔ تاہم اس نے بہت سی باتیں از خود سوچ لی تھیں بلکہ طے کر لی تھیں مثلاً اسے معلوم تھا کہ بعض لوگ جو بظاہر برے اور حقیر نظر آتے تھے (جیسے وہ خود تھا) اندر سے بہت اچھے تھے اور بعض اچھے نظر آنے والے لوگ اندر سے مکروہ تھے اس کا صاف مطلب یہ تھا بعض اچھے جسموں میں بری اور بعض برے جسموں میں اچھی روحیں قید ہو گئی تھیں اسے شک تھا کہ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی گھپلا ہوا تھا کیا پتہ اس کی روح چودھری کے لڑکے کے ساتھ بدل گئی ہو جیسے ایک دفعہ مسجد میں اس کی جوتیاں رحمونائی کی جوتیوں سے تبدیل ہو گئی تھیں۔ وہ ایسی باتیں اکثر سوچتا اور جس قدر سوچتا اس کا شک اور پختہ ہونے لگتا ویسے بھی سرخ و سفید اور بھرے بھرے جسم والی چودھرانی اتنی اچھی اور خوبصورت تھی کہ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ماں کہنے کو جی چاہنے لگتا تھا بعض اوقات اسے لگتا جیسے اس نے پیدا ہونے سے پہلے بھی اسے دیکھا اور اس کے بطن سے جنم لینے کی خواہش کی ہو۔

حویلی میں دو وقت کا کھانا کھانے سے اس کے شبہ کو اور تقویت پہنچی۔ اس نے سنا تھا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے چونکہ یہ حویلی اصل میں اس کا اپنا گھر تھی اس لیے خدا نے اپنے یہاں ملازمت دلوا کر اس کے حصے کی چوگ فراہم کرنے کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اور وہ جسے وہ اپنا بیٹا سمجھتے تھے اس کے حصے میں شہر کا دانہ پانی تھا۔

ماں باپ کے مرنے کے بعد اس نے اپنے گھر آنا جانا تقریباً ترک کر دیا تھا چند پرانے صندوقوں' برتنوں' میلے کچیلے بستروں کے سوا وہاں رکھا بھی کیا تھا جس کی حفاظت کرنے کی ضرورت ہو...... اور پھر حویلی تو دراصل اس کا وہ گھر تھی' جہاں اسے پیدا ہونا چاہیے تھے...... اسے اس کے درو دیوار سے ویسی ہی محبت تھی جیسی اپنے گھر سے ہوتی ہے اور اگرچہ چودھرانی نہیں جانتی تھی کہ وہ اصل میں

اس کی ماں ہے لیکن وہ اسے کسی نہ کسی بہانے زیادہ وقت اپنے پاس روکے رکھتی تھی۔ کبھی چارپائیوں کی ادوائیں کھینچنے' کبھی چودھری کے حقے کی چلم تازہ کرنے اور کبھی یونہی ادھر کی چیزیں اٹھا کر ادھر رکھنے کے بہانے۔ خود کو مصروف رکھتے اور گھر میں زیادہ دیر رکنے کے لیے وہ خود بھی کئی کام نکال لیتا۔ چودھرانی جب کبھی اسے بیٹا کہہ کر پکارتی تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا کہ کس طرح وہ غلط گھر میں پیدا ہونے کے باوجود اپنے اصلی والدین کے پاس اپنے اصلی گھر میں مزے سے رہتا ہے۔

کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ چودھرانی کو بتا دے کہ وہ اس کا اصلی بیٹا ہے اور جو شہر میں پڑھتا ہے دراصل ان غریب میاں بیوی کا بیٹا ہے جو شاید اس کی جدائی کی وجہ سے ناخوش رہتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے اور اسی اندرونی دکھ کی وجہ سے گھل گھل کر مر گئے۔ مگر پھر اسے خوف آتا اگر چودھرانی نے اس کی بات پر یقین نہ کیا تو وہ اسے بیٹے کا دشمن اور حاسد سمجھنے لگے گی۔ کیا پتہ گھر سے نکال دے۔

جہاں تک چودھری کا تعلق تھا وہ اس پر مہربان ضرور تھا شاید اس کے کام کاج کی وجہ سے۔ مگر اس کا مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی تھی اور اسے ہر بات میں میں میخ نکالنے اور جرح کرنے کی عادت تھی اور اس کے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں تھا یہ مسئلہ تو محسوس کرنے اور یقین کرنے کا تھا اور چودھری ان دیکھی باتوں پر آسانی سے یقین کرنے کا قائل نہیں تھا۔

ایک روز اسے نہایت دور کی سوجھی۔ کیا معلوم چودھری سے شادی کرنے سے پہلے چودھرانی اپنے میکے میں اس کی ماں بن گئی ہو؟ اور بدنامی کے خوف سے اس نے خود یا اپنے آشنا کے ذریعے اسے کہیں دور پھنکوا دیا ہو جہاں وہ اس عورت کے ہاتھ لگ گیا جس نے کبوتروں' مرغیوں اور خرگوشوں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی پرورش کی۔ اس نئی سوچ سے اس ادھوری کہانی کی بہت سی گمشدہ کڑیاں بھی خود بخود مل گئیں جو اس نے بچپن میں سنی تھی۔ چودھرانی کو چند سال بعد جب معلوم ہوا ہو گا کہ وہ زندہ اور سلامت ہے تو اس کی سوئی ہوئی ماممتا جاگ اٹھی ہوگی اور اس نے کسی نہ کسی طرح ان غریب میاں بیوی کو اپنے پاس بلوا لیا ہوگا تا کہ اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھ سکے۔

اپنے اس مفروضے کو حقیقت سمجھ لینے کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اب وہ چودھرانی سے نفرت کرے یا محبت۔ اس کی نظروں کے سامنے رہ کر اس کی ممتا کو ٹھنڈک پہنچاتا رہے یا سے جدائی کا دکھ دے کر اپنی محرومیوں کا انتقام لے۔ کبھی کبھی اسے اپنے ان دیکھے باپ کا خیال آتا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا وہ اسے مل جائے تو وہ اس کے سینے سے لگ جائے گا یا اسے قتل کر دے گا۔

ایک بار اس نے یہ بھی سوچا کہ وہ چودھرانی کے قانونی بیٹے کو ٹھکانے لگا دے اور اس کے تڑپنے کا تماشہ دیکھے۔ ہاں۔ چودھرانی

اگر ہمت سے کام لے اور اسے سب کچھ سچ سچ بتا دے تو وہ اسے معاف کر سکتا ہے مگر اسے یقین تھا کہ وہ کچھ نہیں بتائے گی وہ اپنا ہنستا بستا گھر' ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی اور اپنے قانونی بیٹے کا مستقبل کیسے داؤ پر لگا سکتی تھی۔ یہ معمہ اسے خود ہی حل کرنا ہوگا اور اس کے لیے اسے چودھرانی کے میکے گاؤں جانا اور وہاں کچھ عرصہ رہ کر گڑے مردے اکھاڑنا ہوں گے۔

اس نے طے کر لیا کہ وہ اس بزدل اور گنہگار عورت کی چاکری چھوڑ دے گا اور یہاں سے چلا جائے گا اور جب تک اسے تمام حالات ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہو جاتے واپس نہیں آئے گا۔

پھر ایک صبح اس نے حویلی کی چاکری کا طوق گلے سے اتار پھینکا۔ اس نے اپنے حصے کا کھانا حویلی کے کتوں میں تقسیم کر دیا اور بغیر کسی کو بتائے گاؤں سے نکل آیا۔

کوئی ایک کوس دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا اور حیران ہوا۔

حویلی کا ایک پلا اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اتنا چھوٹا اور کمزور سا پلا اس کے پیچھے اتنی دور تک چلا آیا تھا اسے عجیب مسرت آمیز حیرت ہوئی۔ وہ تھکا تھکا سا چلا آ رہا تھا ایک ٹیلے پر بیٹھ کر وہ اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

پلے نے اپنی فاختائی دم ہلاتے ہوئے اس کے پاؤں چاٹے تو اسے عجیب سی لذت کا احساس ہوا۔ اس نے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور اس کے جسم پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا پھر اسے نیچے رکھ کر اور اس کا منہ گاؤں کی طرف کر کے بولا۔

''مجھے بہت دور جانا ہے تم میرا ساتھ نہ دے سکو گے واپس چلے جاؤ''

پلے نے جواب میں اس کی پنڈلی سے اپنی تھوتھنی رگڑی پھر اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کرے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا آتی بار وہ صدر دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے نہیں آیا تھا۔ اس چھوٹے سے پلے کو دھوپ اور سفر میں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا اور وہ واپس جانے پر رضامند نہیں تھا ویسے بھی اس کا سلامتی سے واپس پہنچ جانا نہایت مشکل تھا۔

بیٹھے بیٹھے وہ سوچ میں پڑ گیا۔

آخر وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے پلا اپنی ماں کی محبت چھوڑ کر اس کے پیچھے چلا آیا تھا؟ یہی نا کہ وہ اسے روٹی ڈالتا تھا۔

اچانک اسے ایسا لگا جیسے اس کے ذہن کے اندھیرے میں بجلی سی کوندی ہو۔

پلے کی ماں سے اسے اپنی ماں اور پھر باپ یاد آیا۔ جب وہ چھوٹا تھا ماں اور باپ دونوں اسے اپنے پاس سلانے کے لیے اصرار

کرتے۔ اگر وہ ایک کے پاس سو جاتا تو دوسرا اسے سوتے میں اٹھا کر اپنے پاس لے جاتا۔ اگر کبھی وہ بیمار پڑ جاتا تو ماں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور اس کا بیمار باپ اپنی بیماری کو بھول کر حکیم کی دکان کے چکر لگاتا۔ اسے یاد آیا وہ حویلی سے رات گئے لوٹتا تھا تو اس کے باپ اس پر برس پڑتا تھا...... شاید وہ اس کے انتظار کی گھڑیاں گن گن کر تھک گیا ہوتا تھا۔

اسے زندگی میں پہلی بار اپنے ماں باپ کی شفقتیں اور محبتیں بھی یاد آئیں۔ ہلے نے جیسے اس کے اندر لگے کسی بٹن کو چھو لیا تھا کہ آپ ہی آپ اس کے اندر روشنی ہوتی چلی گئی اور اس نے ان بہت سی باتوں کی طرح جو اس نے بیس پچیس برسوں میں خود ہی سوچ ڈالی تھیں ایک بات اور سوچی کہ حویلی اور اس کے راتب کی غلامی نے اس کے دل میں اپنوں کے بارے میں شکوک پیدا کیے اور اس سے سارا اعتماد چھین لیا اور وہ اپنی جڑوں کو بھول کر راتب ڈالنے والوں کے سامنے دم ہلانے لگا تھا۔



مائی فٹ

یوں تو ان دنوں ہر جگہ سخت گرمی پڑ رہی تھی مگر اپنے آبائی گاؤں پہنچ کر مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے ہم ایک لمبی شکر دوپہر کی زد میں آ گئے ہیں۔ دن بھر آگ برستی اور لو کے تھپیڑے گھروں' آنگنوں' گلیوں اور کھیتوں کھلیانوں میں اپنی پیاسی زبانوں سے حسن اور ہریالی چاٹتے۔۔۔۔۔۔ سورج کسی خونخوار درندے کی طرح جبڑوں سے لگا خون چاٹتا اپنے کچھار کو پسپا ہوتا تو لوگوں کی جان میں جان آتی مگر زمین اس قدر تپی ہوئی اور ہوا اس قدر دبکی ہوئی ہوتی کہ گئی رات تک لو چلتی اور جھلسے ہوئے نڈھال جسموں کو تازگی نصیب نہ ہوتی۔۔۔۔۔۔ میں اسے ایسے موسم میں یہاں لا کر پشیمان ہو رہا تھا مگر اس نے ابھی تک کوئی شکایت نہ کی تھی۔

اگلے روز ہمیں واپس جانا تھا اس لئے اس کے اصرار پر میں اسے شام کو گھمانے لے گیا مگر دل میں شرمندہ ہو رہا تھا اسے کہاں لے جاؤں کیا دکھاؤں اس نے میرے بچپن کے گاؤں کی خوبصورت اور رومانی باتیں میرے افسانوں میں پڑھی تھیں اور شاید تصور میں بسا رکھی تھیں۔ مجھے لگتا تھا جیسے اس کی خوبصورت آنکھیں ہر جگہ میرا بچپن تلاش کر رہی تھیں مگر ننگ دھڑنگ اور میلے کچیلے بچوں کو گلیوں میں بھاگتے دوڑتے اور جوہڑوں میں چھلانگیں لگاتے دیکھ کر مجھے خفت ہو رہی تھی اور اپنی بے پردگی کے احساس کی دھول سے میرا حلق بند ہو رہا تھا۔ گاؤں اب میرے خیال میں بہت بدل گیا تھا۔

گاؤں سے ملحقہ زمین میں سیم اور تھور کا کوڑھ دور تک پھیل گیا تھا۔ گاؤں کا وہ اکلوتا باغ جہاں ہم آنکھ مچولی کھیلتے' جھولے جھولتے اور زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے تھے' اجڑ چکا تھا۔ برگد کے نیچے جہاں دوپہروں کو محفلیں جمتی تھیں اور ہیر اور سیف الملوک گائی جاتی تھیں اب وہاں بھینسیں بندھی تھیں اور گوبر کا تعفن پھیلا ہوا تھا۔ وہ میدان جہاں کبڈی اور کشتی کے مقابلے ہوتے تھے اور فصلوں کی کٹائی کے دنوں جہاں رہس دھاریے سوانگ رچاتے اور کٹھ پتلیوں کے ناچ دکھاتے تھے۔ ایک غلیظ تالاب کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ آٹا پینے کے گھگھوہ کی ٹوہ ٹوہ' کتوں کے لڑنے' بلیوں کے غرانے اور مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازوں سے مل کر عجیب وحشت سے پھیلاتی رہتی۔۔۔۔۔۔ وہ ناز و نعم میں پلی۔۔۔۔۔۔ مہذب معاشروں میں رہ کر آئی تھی میں اسے اپنا گاؤں دکھانے لایا تھا مگر اس کی موجودگی میں مجھے اپنا گاؤں اور بھی پسماندہ لگ رہا تھا۔ ویسے بھی موجودہ گاؤں میرے بچپن کے گاؤں سے اس قدر مختلف تھا کہ خود مجھے لگ رہا تھا میں کسی اجنبی جگہ پر آ گیا ہوں۔ لوگوں میں پہلے کی طرح محبت نہیں رہی تھی ایک دوسرے کی بجائے اب وہ شہر کے

لوگوں کی طرح روپے پیسے سے محبت کرنے لگے تھے غالباً اس نے میری پریشانی بھانپ لی تھی کہنے لگی۔

''یہ گاؤں بہت اچھا ہے میرے خیال میں اب لوگ زیادہ حقیقت پسند ہوتے جا رہے ہیں موجودہ بحرانی دور کے بطن سے جلد ہی ایک نئے عہد کا آغاز ہوگا۔''

''خاک ہوگا'' میں نے کہا ''یہ تو ہمارا اجتماعی رویہ بن چکا ہے ہم سب میلے پر آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم ایک بے فکری قوم ہیں۔ آتش فشانوں کے دہانوں پر بیٹھ کر چین کی بانسری بجانے والے لوگ اور یہ چھوٹا سا گاؤں بھی ہمارے اسی مجموعی رویے کا ایک حصہ ہے۔ تم دیکھ نہیں رہی ہو۔۔۔۔۔۔ ہر شخص دوسرے سے کیسے الگ تھلگ ہے ترقی یافتہ شہروں کی مشینی بے مروتی اور بے سکونی کا دھواں اور آپا دھاپی کی آنچ یہاں بھی پہنچ گئی ہے۔''

کہنے لگی ''کچھ بھی ہو یہاں کی فضا میں مجھے آزادی اور وسعت کا احساس ہوا ہے ورنہ پچھلے کئی ماہ سے اپنے آپ سے گھن آنے لگتی تھی اپنے ہونے نہ ہونے کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا میں تو یہاں آ کر زمین و آسمان سے نئے رشتے استوار کر رہی ہوں۔''

اس کی ایسی ہی باتوں سے میری ڈھارس بندھی اور خفت کا احساس کم ہوا۔۔۔۔۔۔ اسی شام ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگئی ۔۔۔۔۔۔ جب ہم گھر لوٹ رہے تھے گلی میں پیراں دتہ سے ملاقات ہوگئی۔ گاؤں میں اسی کا ایک تانگہ تھا جو سواری ملنے کی صورت میں جوتا جاتا تھا۔ ہم نے اسے دو ایک روز پہلے ہی اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ وہ ہفتہ کی صبح کو کہیں ادھر ادھر نہ جائے اور ہمیں پکی سڑک پر بسوں کے اڈے پر پہنچا آئے۔ اسے اپنا منتظر پا کر ہمیں خیال آیا کہ وہ صبح کے پروگرام کے بارے میں اطمینان کرنے آیا ہوگا مگر اس نے ہمیں کوئی متبادل انتظام کر لینے کا مشورہ دے کر پریشان کر دیا۔

''کیوں کیا ہوا۔۔۔۔۔۔ کیا گھوڑا بیمار ہوگیا؟''

''نہیں جی'' وہ کہنے لگا ''ابھی ابھی چودھری نور محمد کا پیغام ملا ہے کہ صبح انہیں تحصیل جانا ہے۔''

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں'' میں نے کہا ''تم انہیں بھی ساتھ لے لینا۔''

''نہیں جی۔۔۔۔۔۔ وہ بڑے آدمی ہیں۔۔۔۔۔۔ ہی سواریوں والے تانگے میں نہیں بیٹھیں گے۔''

''کیا ان کا قد بہت زیادہ ہے۔۔۔۔۔۔'' وہ بولی ''اور کیا ہم تمہیں بونے نظر آتے ہیں؟''

پیراں دتہ نے خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر بولا ''ان کے لئے ہمیشہ سالم لے جانا پڑتا ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی ''تو ہم نے تمہیں پہلے سے کہہ رکھا ہے تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ شہر نہیں جہاں سواریوں اور سیٹوں کی ریزرویشن ہو جاتی ہے۔ یہ گاؤں ہے اور چودھری نور محمد اس کے دو تہائی حصے کا مالک ہے اور پیراں دتہ اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ کہنے لگی۔ "آپ خود چودھری سے بات کریں اور بتائیں کہ ہمارا پہنچنا ضروری ہے اور ہم نے تانگہ بک کر رکھا ہے۔"

"وہ بے حد مغرور اور اجڈ آدمی ہے اسے اپنی ہتک سمجھے گا اور برا منائے گا۔"

"تو کیا آپ اس سے ڈرتے ہیں۔" وہ چمک کر بولی "میں خود اس سے بات کر سکتی ہوں۔"

"یہ مناسب نہیں۔" میں نے کہا۔

"بی بی جی۔۔۔۔۔۔ عزت دار آدمی کو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔" پیراں دتہ نے کہا۔

"کمال ہے" وہ غصے سے بولی "آدمی آدمی سے ڈرے۔۔۔۔۔۔ کیسی عجیب بات ہے!"

"سبھی آدمی۔۔۔۔۔۔ آدمی نہیں ہوتے۔" میں نے سمجھایا۔ "آدمیوں کے روپ میں راکشش بھی ہوتے ہیں اور اژدھے بھی۔ بعض اوقات آدمیوں کی جون بدل لیتے ہیں بہرحال تم کسی قلمی کہانی کی ہیروئین نہ بنو اور پریشان نہ ہو کوئی دوسرا انتظام ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔"

"لیکن یہ ایک غلط اور اصول کے خلاف بات ہے۔"

"بہت سی غیر اصولی باتیں ہمارے اردگرد ہر لمحے ہوتی رہتی ہیں اور ہم چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ انسان بعض معاملات میں بے بس ہوتا ہے مگر تم اس معمولی سی بات پر جی میلا نہ کرو۔"

"عجیب بات ہے کہ ایک شخص دوسروں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا محض اس لئے کہ کاغذوں میں اس کے نام اس کی ضرورت سے زیادہ اراضی لکھی ہوئی ہے مگر اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس دور میں رہتا ہے۔"

"وہ اپنے علاقے میں صاحب اقتدار ہے اور اپنے عہد میں رہتا ہے۔ اس وقت میں اور تم بھی چودھری نور محمد کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔۔ وہ یہ لوگ دیہات کو پسماندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ سکول نہیں بناتے' سڑکیں نہیں بننے دیتے' پکی سڑک کے ساتھ علم و آگہی کی روشنی پھیلتی ہے جس میں ان کے اصلی چہرے بے نقاب ہوتے ہیں۔"

وہ دیر تک بولتی رہی اور میں چپ چاپ سنتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے کلاس لئے کئی روز ہو گئے ہیں۔ پیراں دتہ چلا گیا تو میں

اسے تسلی دیتا ہوا گھر لے آیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ رات بھر گھر والوں کا مغز چاٹتی رہے گی مگر تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پیراں دتہ پھر آ گیا۔ کہنے لگا ''اجازت مل گئی ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''میں نے انہیں بتایا کہ آج کل سڑک بہت خراب ہے جا بجا گڑھے پڑے ہوئے ہیں اور گرد و غبار سے کپڑے خراب ہو جاتے ہیں۔''

''پھر؟''

''پھر انہوں نے کالو کو بلا کر صبح سویرے گھوڑے پر زین ڈالنے کا حکم دے دیا۔''

''کون سے گھوڑے پر؟'' وہ چونک کر بولی۔

''اپنے مشکی گھوڑے پر۔۔۔۔۔۔ بڑی اچھی نسل کا ہے۔'' پیراں دتہ نے جواب دیا۔

میں نے پیراندتہ کا شکریہ ادا کیا اور اسے صبح تانگہ لانے کی تاکید کر کے رخصت کر دیا مگر شکیلہ کے ماتھے پر اب تک بل پڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگی۔

''وہ سواریوں والے تانگے میں نہیں بیٹھتا۔۔۔۔۔۔ ہونہہ۔۔۔۔۔۔ ڈرٹی ارسٹوکریٹک ایٹی چیوڈ''

میں نے اس کے کان میں کہا ''اب غصہ تھوک دو۔۔۔۔۔۔ اس بے چارے نے تمہیں دیکھا نہیں ہے ورنہ سواریوں والے تانگے میں بیٹھنا اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔''

اس کا سارا غصہ اتر گیا اور وہ مسکرانے لگی ''مائی فٹ''

اگلی صبح جب ہم تانگے میں سوار ہو کر تھوڑی دور پہنچے تو ہم نے دیکھا آگے آگے سڑک پر چودھری نور محمد اپنے گھوڑے پر سوار کلف دار طرہ لہراتا بڑی شان سے جا رہا تھا۔ گھوڑے کے سموں سے اٹھنے والی گرد سے بے نیاز اس کا ملازم کالو پیچھے پیچھے بھاگتا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ راستہ چلتے اور کھیتوں میں کام کرتے کسان اسے سلام کرتے۔۔۔۔۔۔ خیریت دریافت کرتے اور دعائیں دیتے۔ پیراں دتہ نے تانگے کی رفتار کم کر دی تھی۔ سورج نکلتے ہی خونخوار دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی اور آنے والی شکر دوپہر کے خوف سے چرند پرند سہمے ہوئے تھے۔ ہم دھوپ تیز ہونے سے پہلے اڈے پر پہنچ جانا چاہتے تھے مگر پیراندتہ چودھری نور محمد سے آگے نکلنے کی گستاخی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کالو کو گھوڑے کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر ہمیں اس پر بہت ترس آ رہا تھا مگر ہم چودھری کے کسی معاملہ میں دخل دینا نہیں چاہتے تھے لیکن شکیلہ کے کہنے پر پیراندتہ نے کالو کو تانگے میں سوار ہونے کے لئے آواز دے دی۔ چودھری نے مڑ کر خشمگیں نگاہوں کی تانگے کی طرف دیکھا پھر کالو کو تانگے میں سوار ہونے کی اجازت دے دی۔

نہر کے آخری پل پر چودھری کسی راہگیر کے پاس رک کر باتیں کرنے لگا تو ہم رسمی علیک سلیک کر کے اس کے قریب سے گزر گئے۔

وہ بولی "دیکھنے میں تو خاصا مہذب اور باوقار لگتا ہے۔"

میں نے کالو کی موجودگی کا احساس دلا کر اسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا تو وہ چپ ہو گئی مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ اندر ہی اندر کلاس لے رہی تھی۔

اڈے پر خلاف معمول بے حد رش تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بس آتی مگر رکے بغیر نکل جاتی تھی۔ لوگ گرمی سے بے حال ہو رہے تھے اور ہر شخص جلد از جلد سوار ہو کر اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اب چودھری نور محمد بھی اڈے پر پہنچ گیا اور گھوڑے کی لگام کالو کے ہاتھ میں تھما کر بس کا انتظار کرنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا تھا۔

کافی دیر کے اکتا دینے والے طویل انتظار کے بعد ایک بس آ کر رکی سارے ہجوم نے ایک ساتھ بلہ بول دیا مگر کنڈیکٹر نے سب کو پیچھے دھکیل دیا اور صرف دور کی سواریوں کو سوار ہونے کی اجازت دی۔ خوش قسمتی سے ہمیں دور جانا تھا اس لئے ہمیں سوار کرا لیا گیا اور نسبتاً قریب کی سواریوں جن میں چودھری نور محمد بھی شامل تھا' دروازے سے چمٹی چیختی چلاتی اور منت سماجت کرتی رہیں۔ لوگ بار بار اندر گھسنے کی کوشش کرتے اور کنڈیکٹر انہیں دھکے دے کر سوار ہونے سے روکتا رہا۔ اس دھکم پیل میں چودھری نور محمد کی طرے دار دستار سر سے اتر کر نیچے گر گئی اور گرد سے اٹ گئی۔ اس نے جلدی سے اسے اٹھایا اور جھاڑ پونچھ کر دوبارہ پہن لیا اور بس کے دروازے کی طرف لپکا۔

جب کنڈیکٹر کو یقین ہو گیا کہ دور کی سب سواریاں سیٹوں پر بیٹھ گئی ہیں تو اس نے دوسری سواریوں کو بھی اندر آنے اور کھڑے ہو کر سفر کرنے کی اجازت دے دی۔

بس روانہ ہوئی تو میں نے دیکھا۔ چودھری نور محمد نے اپنی دستار دونوں ہاتھوں سے تھامی ہوئی تھی اور دور و نزدیک کی عام سواریوں کے درمیان پھنسا ہوا نیم ایستادہ تھا اور شکیلہ کے گلاب ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ چمک تھی۔



جیکو پچھے

ایک روز وہ پڑھائی اور کام کاج سے فارغ ہو کر گھر جانے لگی تو انہوں نے کچھ پرانے کپڑے دیئے ان کپڑوں میں زہر مہرہ رنگ کیا ایک مردانہ کرتہ بھی تھا۔ اس کرتے کو دھوتے ہوئے کئی بار اس کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی تھی۔

''بی بی جی...... یہ بھی؟''

''ہاں لے جاؤ' تمہارا بھائی پہن لے گا۔''

وہ سلام کر کے جلدی جلدی گھر آئی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی قیمتی خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو

''جے کو پچھے ایہ خزانہ کتھوں لبھا۔ توں آکھ جی 'بی بی جی نے دتا''

مارے خوشی کے وہ ہنستی چلی گئی اس کی ماں نے حیران ہو کر پوچھا

کیا بات ہے بیٹی...... اتنی خوش کیوں ہو؟''

جواب میں اس نے سارے کپڑے ماں کے سامنے ڈھیر کر دیئے وہ دعائیں دینے لگی۔

''اللہ انہیں بیٹے کی خوشیاں دکھائے دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں''

اس کی ماں نے ایک ایک کپڑے کو کھول اور الٹ پلٹ کر دیکھا پھر خوش اور مطمئن ہو کر بولی تو ان کی خدمت کرتی رہا کر تیرے دین اور دنیا دونوں سنور جائیں گے۔'' ''ماں'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''کہو''

اور جیسے کوئی شہزادی اپنی ملکہ ماں سے نیا باغ لگوا دینے یا بارہ دری تعمیر کرا دینے کی فرمائش کر رہی ہو۔ اس نے کہا۔

''یہ کرتہ مجھے دے دو۔''

''یہ؟'' اس کی ماں نے کہا'' یہ تو مردانہ ہے اور بڑے ناپ کا؟''

''میں سی لوں گی...... تم دے دو نا''

''اچھا''

وہ خوشی سے کھل اٹھی اور کرتہ لے کر بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی جیسے اسے ڈر ہو کہ ماں اپنا ارادہ نہ بدل لے۔

یوں تو بی بی جی سب سے محبت کرتی تھیں مگر اس پر بہت مہربان تھیں اور اس کا خاص خیال رکھتی تھیں اکثر بچا کھچا سالن' دودھ یا لسی اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں گھر لے جانے کے لیے اسے دیتی رہتی تھیں اور اپنی اترن تو وہ ہمیشہ اسی کے گھر بھجواتی تھیں۔ وہ بھی ان کی خدمت سب سے زیادہ کرتی سب سے پہلے آتی' گھر کی صفائی کرتی' برتن دھوتی' مرغیوں کو دانہ ڈالتی' گھڑوں میں تازہ پانی بھرتی' پھر جب دوسری لڑکیاں آجاتیں تو ان کے ساتھ ننگے پاؤں زمین پر بیٹھ کر سبق یاد کرتی۔

''جے کو پچھے توں بندہ کس داہیں توں آکھ جی' اللہ تعالی دا''

سبق پڑھنے اور یاد کرنے کے بعد سب لڑکیاں چلی جاتیں مگر وہ اپنے لیے کوئی نہ کوئی کام نکال لیتی۔ یوں تو بی بی جی کے سارے کام کرنے میں خوشی محسوس ہوتی تھی مگر کپڑے دھونا اسے بہت اچھا لگتا تھا خاص طور پر جب ان کا بیٹا شہر سے آیا ہوتا...... بی بی جی اس کی دھلائی کی بہت تعریف کرتی تھیں اور لانی اور کھارے سے اپنے گھر والوں کے موٹے' پھٹے پرانے اور کھردرے کپڑے دھونے کے مقابلے میں اسے صابن سے یہ رنگ برنگے ریشمی کپڑے دھونا بہت اچھا لگتا تھا ان سے ایسی مہک آتی جو اس کے لیے بہت انوکھی تھی۔ نمبرداروں کے باغ میں کھلنے والے گلاب اور چنبے ہاتھوں میں رچی مہندی' بور پر آئے آم کے پیڑوں اور بارش کے بعد زمین سے اٹھنے والی مٹی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو سے مختلف اور اس قدر مدھم اور ملائم کہ ایک بار جی بھر کے سونگھ لینے سے ختم ہو جائے مگر پھر کئی کئی دنوں تک سونگھنے والے کے اندر سے اٹھتی رہے۔ وہ ان کپڑوں کو چھوتی تو اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں وہ ان پر صابن رگڑتی تو اسے لگتا وہ خود بھی کھرنے لگی ہے۔ لذت کی جھاگ سے اس کے ہاتھ لتھڑ جاتے۔ کپڑوں کو دھو اور نچوڑ کر رسی پر لٹکاتی تو اسے لگتا اس کی اپنی روح کا میل بھی اتر گیا ہے اور وہ دھل کر نکھر گئی ہے سب کچھ اجلا اجلا اچھا اچھا لگنے لگتا۔

جس رات اس نے کرتہ مکمل کیا اس رات اسے امارے خوشی کے دیر تک نیند نہ آئی اسے لگتا تھا جیسے وہ کرتہ پہن کر ہوا میں اڑنے لگے گی اس کا جی چاہا وہ اسی وقت ہوا میں اڑنے لگے' گاؤں کے لوگ اسے حیرت سے تکتے رہیں اور وہ ہوا میں اڑتی چاندنی میں تحلیل ہو جائے۔ اس رات اس نے عجیب وغریب خواب دیکھے' جڑاؤ تخت' مور چھل' کنیزیں!!!

صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ تھکی تھکی سی تھی۔ ماں آٹا گوندھ رہی تھی اور بھائی لکڑیاں چیر رہا تھا۔ اچانک اسے کرتے کا خیال آیا اور اسے لگا جیسے اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھی اور ہاتھ منہ دھو کر اندر چلی آئی مگر جونہی کرتہ اس کے جسم سے مس ہوا اس کے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اس نے گھبرا کر اسے وہیں چھوڑا اور باہر آ گئی۔

اس روز جب وہ بی بی جی کے ہاں پہنچی تو اس نے خوشی کی ایک اور خبر سنی ان کا بیٹا امتحان سے فارغ ہو کر گاؤں واپس آ رہا تھا مگر اس کوشی کی خبر کا تعلق تو بی بی جی سے تھا جو اپنے بھائی کی بیٹی سے اس کا بیاہ کرنا اور اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھیں یا پھر اللہ وسایا سے تھا جس کے سالم تانگے میں بیٹھ کر وہ آئے گا یا پھر گلیوں کے آر پار کچی پکی دیواروں سے تھا جن کے درمیان سے گھر کر وہ گھر تک پہنچے گا پھر وہ کیوں خوش ہو رہی تھی؟

''آج میرے ساتھ کون کام کرائے گی؟''

''میں''

''میں''

''میں''

مگر وہ چپ رہی اس کے دل پر چوٹ سی لگی تھی بی بی جی اس کے ہوتے ہوئے دوسریوں سے کیوں پوچھ رہی تھیں

''عنایتی...... تم زردہ رنگ لے آؤ''

''آمنہ...... تم مرغی ذبح کرالاؤ''

''اختری...... تم چاول صاف کرو''

''اور میں کیا کروں؟'' اس نے تلملا کر دل میں کہا ''اپنا سر؟''

''اور تم'' بی بی جی کو اس کا خیال بھی آ ہی گیا۔ انہوں نے اسے لمحہ بھر کے لیے ایسی نظروں سے دیکھا جو اس کے آر پار ہو گئیں اسے لگا جیسے انہوں نے اس کے اندر کا سارا حال پڑھ لینا چاہا ہو مگر اس کے اندر کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں تھا بس زیادہ سے زیادہ وقت ان کے پاس رہنے اور ان کے کام کرنے کی خواہش تھی یا پھر وہ ان کے بیٹے کے بیاہ کی بات سوچ کر خوش ہوئی تھی۔ خوش ہونا تو کوئی جرم نہیں تھا؟

''تم گھر جاؤ'' بی بی جی نے کہا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ مگر بی بی جی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا

''تھوڑی دیر بعد جب یہ سب چلی جائیں گی ماں سے پوچھ کر آ جانا''

اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا جی چاہا ان کے پاؤں چھو لے مگر بی بی جی برا مان جاتیں

’’بے کو پچھے توں اپنی خوش کیوں ایں توں آکھ جی...... خورے کیوں؟‘‘

اور حالانکہ بی بی جی جانتی تھیں کہ وہ شام کو پہنچے گا مگر انہوں نے ابھی سے اس کا انتظار شروع کر دیا تھا اور مختلف بہانوں سے چھت پر آنے جانے لگی تھیں اس کا اپنا جی چاہ رہا تھا وہ بہانوں سے چھت پر آنے جانے لگی تھیں اس کا اپنا جی چاہ رہا تھا وہ چھت پر جائے اور کا بک کی طرح وہیں گڑی رہ جائے۔

سہ پہر تک سارے کام ختم ہو گئے اس نے دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا اس کا جی چاہتا تھا وہیں رہ جائے مگر بی جی نے اسے گھر بھیج دیا۔ کاش وہ اس کی موجودگی میں آتا اور وہ دیکھ سکتی کہ بی بی جی کس محبت سے اس کی پیشانی چومتی ہیں۔ پیشانی چومنے کے خیال سے اس کو کوکھ میں ٹیس سی اٹھی اور اس کا سارا اندر ممتا کے جذبات سے بھر گیا۔

ماں نے اسے تنور گرم کرنے کو کہا' وہ چھت پر ایندھن لینے کے لیے گئی تو اس نے دیکھا گاؤں کی اونچی منڈیریں' درخت اور مسجد کے میناروں پر بیٹھے ہوئے کبوتر بھی شہر سے آنے والی سڑک کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور وہ خود؟...... اس کے من میں کیا ہے؟ اس نے خود سے پوچھا

’’بے کو پچھے تیرے اندر کیہہ اے توں آنکھ جی تنور‘‘

تنور میں روٹیاں لگاتے ہوئے اسے بار بار احساس ہوتا رہا اس کے اندر بھی روٹیاں لگی ہیں جو پک پک کر جھلسنے لگی ہیں مگر کوئی اتارتا نہیں ہے وہ اپنے گھر میں تھی مگر اسکا دل اور دماغ بی بی جی کے ہاں رہ گئے تھے اسے بی بی جی کے ہاں دوبارہ جانے کا کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں اسے بے پناہ حجاب آ رہا تھا حالانکہ چند ماہ پہلے وہ چھٹی گزار کر گیا تھا تو وہ بی بی جی کے ساتھ اسے سیم نالے کے پل تک چھوڑنے گئی تھی اور سارے کچھ بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی پتہ نہیں پچھلے چند دنوں میں ایسا کیوں ہو گیا تھا کہ اس کے ذکر اور تصور سے اس کے گال دہکنے اور کانوں کی لویں جلنے لگی تھیں۔

رات کو چھت پر جا کر سونے سے پہلے اس نے اندر جا کر ریشمی کرتہ پہنا اور اسے یہ جان کر بہت اطمینان ہوا کہ اس بے جسم میں سنسنی کی لہر نہیں دوڑی بلکہ یوں لگا جیسے کسی تپتے ہوئے برتن سے گرد ٹھنڈا بھیگا ہوا غلاف چڑھا دیا جائے۔

گاؤں کے سارے لوگ چھتوں پر سو رہے تھے اس کے قریب ہی اس کی ماں اور بھائی کی چارپائیاں تھیں مگر اسے ڈر لگ رہا تھا جیسے سوتے میں کوئی دیو اسے اٹھا کر لے جائے گا یا کوئی جن بھوت نتھنوں کی راہ اس کے اندر حلول کر جائے گا۔

وہ بار بار سونے کی کوشش کرتی رہی مگر اس کا دھیان بی بی جی کے گھر کی طرف چلا جاتا...... اب وہ اسے کھانا کھلا رہی ہوں گی

اب اس کا بستر بچھا رہی ہوں گی اب اس کے قریب بیٹھ کر اس سے باتیں کر رہی ہوں گی۔ اچانک وہ چونک پڑی۔

اسے لگا کوئی آہستہ آہستہ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ رہا ہے خوف سے اس کا جسم لرزنے لگا چور ڈاکو جن بھوت...... کئی طرح کے وسوسوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس نے چاہا ماں کو آواز دے بھائی کو پکارے مگر خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی اور آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اس نے دل کڑا کر کے آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی کہ وہ اس کی پائنتی کی طرف کھڑا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس کی ماں اٹھ کر اس کے قریب آئی

''ابھی ابھی کوئی یہاں کھڑا تھا'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کا بھائی جاگ گیا تھا اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر اور نیچے صحن میں جھانک کر دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔

''تو نے خواب دیکھا'' ماں نے کہا'' آیت الکرسی پڑھ کر سو جا''

اس نے آیۃ الکرسی اور بہت سی دعائیں جو اسے یاد تھیں پڑھیں اور چادر میں گھس کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اسے نیند نہ آئی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اس نے پشیمانی سے سوچا مگر اسے بھی تو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھے۔ بی بی جی اتنی نیک ہیں سارا گاؤں ان کی عزت کرتا ہے۔ مگر وہ ان کی عزت کو خاک میں ملانا چاہتا ہے۔ اگر اس کا بھائی دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟ یہ سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر وہ ایسا تو نہیں تھا ہاں اسے شہر کی ہوا لگ گئی ہے پتہ نہیں کیسی بری بری باتیں سیکھ گیا ہو۔ وہ دیر تک سوچتی رہی۔

سیڑھیوں پر پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے منہ سے چادر ہٹائی' شک دور کرنے کے لیے کان لگا کر سنا۔ دھیمے قدموں سے کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا' چاپ قریب آتی گئی پھر ایک ہاتھ بلند ہوا' پھر سر دکھائی دیا پھر چہرہ' کندھے اور پھر پورا جسم...... اس نے دیکھا وہ بالکل وہی تھا' بی بی جی کا بیٹا۔ پھر وہ آخری سیڑھی پر بیٹھ گیا اور اسے اشاروں سے اپنی طرف بلانے لگا وہ تھر تھر کانپنے لگی اس نے چاہا چیخ پڑے مگر آواز اس کے گلے میں پھنس گئی۔ اس نے چادر سے اپنا سارا وجود اچھی طرح سے ڈھانپ لیا وہ خشک پتے کی طرح لرز رہی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

پھر وہ دیر تک چادر کے کونے پکڑ کر کھینچتا اور اسے ستاتا رہا' وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بھائی کو خبر ہو وہ چپ چاپ لیٹی رہی پھر تنگ آ کر اٹھی اور بھاگ کر ماں کے پاس چلی گئی اور ننھی بچی کی طرح اس سے لپٹ کر سو گئی۔

صبح اٹھ کر اس نے رات کے واقعہ کو یاد کیا تو اس کے دل کا غبارہ رنج و غم کی ہوا سے بھر گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بی بی جی سے ضرور شکایت کرے گی اور اس کے بعد بھی وہ ان حرکتوں سے باز نہ آیا تو اپنے بھائی کو بھی سب کچھ بتا دے گی۔

چھت سے اتر کر اس نے سب سے پہلے ریشمی کرتہ اتار کر پھینک دیا اور اپنے معمولی اور پرانے کپڑے پہن لیے' پھر منہ ہاتھ دھو کر بی بی جی کے ہاں چل دی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جاتے ہی سب کچھ کہہ ڈالے گی اور سبق پڑھے اور کام کاج کیے بغیر الٹے قدموں واپس آ جائے گی۔

بی بی جی صحن میں بچھی اپنی اور اپنے بیٹے کی چارپائیوں سے بستر لپیٹ رہی تھیں وہ شاید حسب معمول کھیتوں کی طرف ہوا خوری کے لیے نکل گیا تھا۔ اس نے موقع کو غنیمت جانا اور چھوٹتے ہی بولی۔

''بی بی جی...... آپ کا بیٹا......!''

بی بی جی نے اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

''خدا کرے خیریت سے ہو...... پتہ نہیں کیوں نہیں آیا''

وہ حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی۔



دیوار گریہ

گاؤں کے سرکردہ لوگوں کے وفد سے میں نے اتوار تک کی مہلت مانگی اور وعدہ کیا کہ میں گاؤں آ کر اسے سمجھاؤں گا ہو سکتا ہے وہ میری بات مان جائے۔

انہوں نے کہا "ہم اتوار تک آپ کا انتظار کریں گے ہمیں آپ کا بہت لحاظ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کی بات ضرور مان جائے گی کیونکہ وہ صرف آپ سے ڈرتی ہے۔"

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اگر وہ مجھ سے ڈرتی ہے تو میں بھی تو اس سے ڈرتا ہوں ایک انجانے خوف کی دیوار ہم دونوں کے درمیان حائل ہے کبھی کبھی یوں لگتا ہے ہم دونوں اپنے اپنے ہاتھوں پر اس دیوار کو روکے کھڑے ہیں اور ہم میں سے جس نے بھی ہاتھ پیچھے ہٹائے وہ دیوار کے نیچے دب جائے گا۔

وہ میری سگی خالہ نہیں تھی لیکن وہ مجھے اپنی سگی خالاؤں سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ خوبصورت چیزیں ہمیں دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگتی ہیں خواہ ان کا تعلق ہم سے ایک جیسا ہو۔ ہم اپنے بچوں میں سے خوبصورت ترین بچے سے زیادہ پیار کرتے ہیں اور خواہ ہمارے قدموں میں گیارہ کڑیل جوان بیٹے بیٹھے ہوں بارہویں خوبصورت بیٹے کی جدائی میں ہماری آنکھیں روزن زنداں بن جاتی ہیں۔

خوبصورت بیٹیوں کے بڑھتے ہوئے بدن اور روز بروز گلابی ہوتے رخسار دیکھ کر ہمیں خواہ مخواہ ان پر پیار آنے لگتا ہے۔ بد صورت بہن کو ہم آسانی سے ڈانٹ سکتے ہیں لیکن خوبصورت بہن کی فرمائش آسانی سے نہیں ٹال سکتے۔

خالہ خوبصورت تھی اس لئے مجھے اپنی سگی خالاؤں سے اچھی لگتی تھی۔ ویسے بھی ہم بچپن میں ایک ساتھ کھیلے تھے۔ وہ مجھ سے کچھ ہی بڑی تھی مگر اسے کہانیاں بہت یاد تھیں۔ میری اس سے بڑی دوستی تھی اور میں زیادہ تر وقت اسی کے ہاں گزارتا تھا۔ کبھی کبھی خالہ اپنی خالہ کے ہاں چلی جاتی تو میرا دل اداس ہو جاتا۔ میں ابا کے صندوق سے وہ کتاب نکال لیتا جس میں ہر طرح کے تعویذ اور گنڈے تھے۔ یہ کتاب ابا کے ہاتھ دادا جان کے انتقال کے بعد آئی تھی لیکن میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں کتاب سے بچھڑے اور روٹھے ہوئے محبوب کو منانے اور واپس بلانے کے تعویذ نقل کر کے آزماتا اور خالہ کو چند ہی روز میں واپس آنا پڑتا لیکن اسے بالکل پتہ

نہ چلتا کہ میں نے اسے کس طرح واپس آنے پر مجبور کیا ہے۔

پھر خالہ اچانک بڑی ہوگئی اور زیادہ خوبصورت بھی۔اس کے گال انگاروں کی طرح دہکنے لگے۔آنکھیں زیادہ چمکیلی اور نشیلی ہو گئیں اور بال لمبے ہوکر ٹخنوں تک پھیل گئے جب کبھی وہ مجھے پیار کرتی اور میرا منہ چومتی' مجھے اس سے بڑی میٹھی میٹھی خوشبو آتی اور میرا جی چاہتا وہ میرا منہ چومتی رہے اور مجھے اپنے نرم نرم سینے سے لگا کر بھینچتی رہے۔مگر وہ اب مجھ سے زیادہ منظوم پنجابی داستانوں کے کرداروں سے محبت کرنے لگی تھی۔ان کرداروں میں اسے ہیر اور مرزا پسند تھے اور مجھے رانجھا اور صاحباں۔۔۔۔۔۔اس اختلاف پر کئی بار ہمارا جھگڑا ہو جاتا اور ہم کئی کئی روز تک ایک دوسرے سے بات نہ کرتے۔

خالہ کی آواز بڑی اچھی تھی وہ اکثر ہیر وارث شاہ کے بند گنگنایا کرتی۔

''میرے میکے کی گلیوں کو ہاتھ جوڑ کر میرا سلام کہنا اور ترنجن میں جا کر میری سکھیوں کو میرا پیغام دینا کہ وہ مجھے دشمنوں کے حوالے کر کے بھول گئی ہیں۔میاں رانجھا کے پاؤں پکڑ کر اور میری طرف سے ہاتھ جوڑ کر کہنا کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو وہ بے آسروں کا آسرا ہے۔میرے ماں باپ سے کچھ بھی نہ کہنا انہوں نے مجھے گھمن گھیر میں غرق کیا ہے ان سے اب میرا کوئی ناطہ نہیں ہے۔''

خالہ جب مجھے ہیر پڑھ کر سناتی تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ میری بجائے اپنے آپ کو سنا رہی ہو۔ہیر پڑھنے پر اسے کئی بار ڈانٹ بھی پڑ چکی تھی۔اڑوس پڑوس میں بھی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔گاؤں میں عورتوں اور لڑکیوں کے لئے ہیر وارث شاہ پڑھنا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا۔لیکن مجھے اور خالہ کو اس میں کوئی برائی نظر نہ آتی تھی۔

کبھی کبھی خالہ کسی لفظ پر اٹک جاتی تو مجھے بڑی خوشی ہوتی میں چونکہ سکول میں پڑھتا تھا اس لئے ہجے کر کے لفظ پڑھنے میں کامیاب ہو جاتا۔لفظ جتنا مشکل ہوتا وہ اتنا ہی زیادہ پیار کرتی میرا جی چاہتا اسے ایک بھی لفظ پڑھنا نہ آئے۔میں دل ہی دل میں دعا مانگتا۔اللہ کرے وہ اندھی ہو جائے میں اسے کتاب کے سارے لفظ پڑھ پڑھ کر سناتا رہوں اور ہر لفظ پر۔۔۔۔۔۔مگر خیر یہ بچپن کی باتیں ہیں۔

پھر مجھے تعلیم کے سلسلہ میں شہر بھیج دیا گیا اور میں خالہ سے جدا ہو گیا۔میں شہر میں جب بھی کسی حسین عورت کو دیکھتا مجھے خالہ یاد آ جاتی اور دل ہی دل میں اس کا خالہ سے موازنہ کرنے لگتا۔شہر میں قدم قدم پر حسین عورتیں تھیں لیکن میں نے خالہ سے بڑھ کر کسی کو نہ پایا۔لمبی لمبی کاروں میں حسین اور امیر عورتوں کو دیکھ کر مجھے رشک آتا کاش خالہ بھی ایسی ہی کسی لمبی چمکیلی کار میں بیٹھی ہو اور اس کا دولت مند میاں اس کی ہر ادا اور فرمائش پر آنکھیں بچھا رہا ہو۔

خالہ سے اب میری ملاقات بڑے وقفوں سے ہوتی تھی۔ لیکن میں جب بھی گاؤں جاتا زیادہ تر وقت اس کے گھر میں گزارتا۔ اکثر ہمارے گھروں کے تعلقات خوشگوار نہ ہوتے اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بند ہوتا لیکن ہم پر اس کا کچھ اثر نہ پڑتا۔ خالہ کے گھر والے مجھ سے بات نہ بھی کرتے تو بھی خالہ سے مل کر ساری کوفت دور ہو جاتی۔ وہ مجھے طرح طرح کی چیزیں اور پکوان کھلاتی اور ہم پہروں باتیں کرتے رہتے۔ گاؤں کی باتیں' شہر کی باتیں' فلموں کی باتیں جو میں شہر میں دیکھتا تھا اور کتابوں کی باتیں جو ہم دونوں ایک دوسرے کو پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

خالہ اب مجھ سے اور بڑی ہو چکی تھی۔

کبھی کبھی مجھے وہ ایک بڑی عورت نظر آتی اور مجھے اس سے جھجک محسوس ہونے لگتی لیکن ایک بار جب ہم باتیں شروع کر دیتے تو ساری اجنبیت اور جھجک خود بخود دور ہو جاتی۔ خالہ اب بے قرار ہو کر مجھے لپٹاتی اور چومتی نہیں تھی اور شاید میں بھی اب اس کی توقع نہیں کرتا تھا۔

ایک بار گرمیوں کی چھٹیاں تھیں' جو کسی طرح ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ گھر والوں نے مجھے خالہ کے ہاں جانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ میں نے پہلے پہل اس کی پرواہ نہیں کی مگر پھر سخت ڈانٹ ڈپٹ ہوئی اور والدہ نے مجھے باور کرانے کی کوشش کی دشمن کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا کیا پتہ وہ لوگ مجھے زہر دے کر ہلاک کر ڈالیں اور دشمنی کا بدلہ چکائیں۔ میں دل ہی دل میں ہنسا' خالہ کے ہوتے ہوئے مجھے اس گھر میں زہر کیسے دیا جا سکتا تھا۔ میرے لئے ایسا سوچنا بھی حماقت تھی لیکن پھر والدہ کے بار بار کہنے سے شک نے میرے دل کے کسی گوشے میں ڈیرہ جما لیا اور میں نے طے کر لیا کہ خالہ کے ہاں بہت کم جاؤں گا اور ان کے ہاں سے کھانے پینے کی کوئی چیز تو بالکل نہیں لوں گا۔

دو ایک روز بعد مجھے چلے جانا تھا اور میں خالہ سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے ایک سہ پہر میں گھر والوں سے چوری اسے ملنے چلا گیا۔ اتفاق سے وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ اس کی طبیعت اچھی نہ تھی اور وہ سر کو دوپٹے سے باندھے بستر پر لیٹی ہوئی تھی مجھے دیکھ کر کھل اٹھی اور حسب عادت مسکرا کر بولی۔

''بسم اللہ''

میں پائنتی کی طرف بیٹھ گیا وہ کہنے لگی۔ ''تو نے اچھا کیا جو چلا آیا۔۔۔۔۔۔ میرا بڑا ہی دل چاہ رہا تھا کہ تجھے دیکھوں۔ کل سے میری طبیعت ٹھیک نہیں اور تو مجھے بہت یاد آ رہا تھا۔''

مجھے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی میں اٹھ کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور اس کا سر دبانے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہنے لگی۔ ''سنا ہے تیری چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ ہاں تو مجھے شہر جا کر خط لکھ بھیجا کر۔۔۔۔۔۔ مگر اڑیا۔۔۔۔۔۔ آسان لکھنا تو اب بہت پڑھ گیا ہے نا''

''تو جواب دے گی تو لکھوں گا۔''

وہ ہنس پڑی' بولی'' مجھے لکھنا کہاں آتا ہے۔''

''کسی سے لکھوا لینا۔''

''نہ بابا۔۔۔۔۔۔'' اس نے کہا'' لوگ سمجھیں گے پتہ نہیں کسے خط لکھوا رہی ہے۔''

پھر خالہ میرے منع کرنے کے باوجود میرے لئے دودھ گرم کر لائی۔ میرا ماتھا ٹھنکا' اس نے دودھ میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔

میرے لئے اب نہایت مشکل صورت حال تھی۔ جی چاہتا تھا بھاگ جاؤں مگر خالہ کا رویہ دیکھ کر انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ میں اس کے بارے میں ایسا سوچ رہا ہوں تو صدمے کی تاب نہ لا کر وہ خود ضرور زہر پھانک لیتی۔

پھر اس خیال سے کہ مجھے خون کی قے کرتے دیکھ کر وہ خود ہی پشیمان ہو گی اور زندگی بھر اپنے اس فعل پر سینہ کوبی کرتی رہے گی میں نے دودھ کا گلاس منہ سے لگایا اور غٹا غٹ پی گیا۔۔۔۔۔۔ اور منہ اور نتھنوں سے خون جاری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ساتھ ہی اتنی جلدی دنیا سے رخصت ہو جانے کے خیال سے میری آنکھوں سے آنسو آ گئے۔

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''میں واری۔۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟''

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے کہا۔۔۔۔۔۔'' امی نے کہا تھا' تم لوگ مجھے زہر دے دو گے۔''

وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ کچھ دیر پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی'' اور یہ جانتے ہوئے بھی تو نے دودھ پی لیا۔''

''اور کیا کرتا؟''

''ہائے میں مر جاؤں'' اس نے کہا'' تجھے مجھ پر اتنا اعتبار ہے؟''

مجھے ایسا لگا جیسے میں بے حد کمینہ ہوں اگر خالہ کو پتہ چل جائے کہ میں نے اس پر شک کیا تو؟

وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ '' دیکھ اڑیا۔۔۔۔۔۔ تو ایسا کبھی نہ سوچنا۔ تجھے زہر دینے سے پہلے میں خود سو بار زہر نہ پھانک لوں گی۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ ''زہر تو ایک ہی بار میں مار ڈالتا ہے پھر تو سو بار کیسے پھانکے گی؟''

''اچھا گولی مار زہر کو'' وہ بولی ''کوئی اور بات کر۔''

مجھے پھر ہنسی آ گئی۔ ''زہر کو گولی کیسے ماری جا سکتی ہے؟''

اس نے میرا ماتھا چوما اور کان مروڑ کر کہا۔ ''تو بہت شریر ہو گیا ہے۔''

میرا جی چاہتا تھا ہنستا رہوں' ہنستا ہی چلا جاؤں۔ ہنسی اور خوشی سے میرا سارا اندر بھر گیا تھا۔ کئی برس بعد اس کے خوبصورت ہونٹ میری پیشانی سے چھوئے تھے۔ دنیا بھر کی لذت اور خوشی ایک لمحے میں قید ہو گئی تھی لیکن پھر خالہ سے اکبرے ماچھی والی بات سن کر میری ساری ہنسی اور خوشی کافور ہو گئی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ ایک کسان کی بیٹی ہو کر ایک کمی سے بیاہ کیسے کرے گی اور اگر بیاہ نہیں کرے گی تو کیا کرے گی؟ مجھے اس پر بڑا غصہ آیا اور میرا جی چاہا اسے چوٹی سے پکڑ کر صحن میں گھسیٹوں مگر اس کی چوٹی دیکھ کر میرا سارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور میں سوچنے لگا کہ وہ اتنی بھاری اور لمبی چوٹی کیسے اٹھائے پھرتی تھی۔

جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا خالہ نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اس نے اپنے ہاتھ سے لڈو بنائے اور اپنی سہیلیوں کو اور مجھے خوب کھلائے۔ اتفاق سے ان دنوں ہمارے تعلقات بھی خوشگوار تھے لیکن مجھے اس بات کا بے حد رنج تھا کہ گاؤں میں اب اس کے اور اکبرے ماچھی کے بارے میں طرح طرح کی باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ یہ باتیں سن سن کر میرا دل اس کی طرف سے کھٹا ہو گیا تھا اور مجھے اس کی کوئی بات اچھی نہ لگتی تھی لیکن میں اسے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اس کا سامنا کرنے سے کیوں گھبراتا تھا اس کا مجھے خود بھی پتہ نہیں تھا۔

پھر میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور زیادہ تر ہوسٹل میں رہنے لگا۔

جب کبھی گاؤں جاتا اور میرے ہم عمر مجھ سے کہتے کہ یار اعظم تیری خالہ نے بڑا گندڈالا ہوا ہے تو شرم سے میری گردن جھک جاتی اور مجھے خالہ پر غصہ آنے لگتا۔ اس لئے میں نے اب گاؤں جانا کم کر دیا اور دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔

ایک ایک کر کے کئی برس گزر گئے۔ میں نے تعلیم مکمل کر کے ملازمت کر لی اور میری شادی شہر میں ہو گئی۔

اب میں شہر میں رہتا تھا اور کبھی کبھار گاؤں جاتا تھا۔ تاہم بہت سے لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور مجھے ہر طرح کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ گاؤں والے باتیں بنا بنا کر تھک گئے تھے خالہ اور اکبرے ماچھی کی بات اب عام سی ہو گئی تھی لیکن کبھی کبھی گاؤں والے

اچانک بھڑک اٹھتے تھے۔ مولوی صاحب گاؤں پر عذاب الٰہی نازل ہونے اور قرب قیامت کی پیش گوئیاں دہرا دہرا کر تھک چکے تھے لیکن خالہ سے براہ راست الجھنے کا کسی کو حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ اپنے والد کے مرنے کے بعد وہ اور سرکش ہوگئی تھی اور خوب کھری کھری سناتی تھی۔ خالہ کی طرح اکبرے کو ٹوکنے کی بھی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ ہر وقت ڈب میں پستول رکھتا تھا اور اس سے کسی بھی قسم کے اقدام کی توقع کی جاسکتی تھی۔

خالہ اب وہ خالہ نہیں رہی تھی جو کبھی گاؤں والوں کے دلوں پر حکمرانی کرتی تھی اور جسے دیکھ کر نوجوانوں کا ایمان ڈول جاتا تھا اور جسے بیٹی یا بہن کہہ کر پکارنے والوں کے لہجے میں بھی عجیب طرح کی مٹھاس ہوتی تھی۔ سخت جسمانی محنت کی وجہ سے اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا اور رنگت تبدیل ہوگئی تھی۔ وہ گھر بار کے کام کاج کے علاوہ کھیتوں میں بھی مردوں کی طرح کام کرتی تھی۔ اکبرے کے سوا پورے گاؤں میں اس کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ اکبرے کبھی اس کے گھر نہیں آتا تھا لیکن سارا گاؤں جانتا تھا کہ وہ باہر ہیر رانجھا کی طرح ملتے تھے اور خالہ اس کے لئے دو وقت کھیتوں پر روٹی لے کر جاتی تھی۔ اسے دیکھ کر اس پر ترس ضرور آتا تھا لیکن یہ سوچ کر ان حالات کی وہ خود ذمہ دار ہے' غصہ آنے لگتا تھا۔

لیکن اب حالات کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے میرا گاؤں جانا اور اس سے بات کرنا ضروری ہوگیا تھا پروگرام کے مطابق اتوار کے روز گاؤں پہنچ گیا۔

رات کا کھانا کھا کر اور والدہ سے اجازت لے کر میں اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوکر میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ وہ اپنی باتوں کے شہد میں مجھے ڈبو دے میں ایک ہی سانس میں اپنی بات کا سارا زہر انڈیل دوں گا اور اسے کھری کھری سناؤں گا۔ کئی لمحوں یا شاید صدیوں بعد میں نے دروازے پر دستک دی۔

دروازہ کھولے بغیر اس نے دستک پہچان کر اور چہک کر کہا۔ ''بسم اللہ''

اس کی آواز سے اس کا گھر ہی نہیں گلی بھی روشن ہوگئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی بوڑھی اور نابینا ماں کے پاس لے گئی اور بولی۔

''دیکھ ماں۔۔۔۔۔۔ اعظم آیا ہے۔''

میں نے سلام کیا۔ اس کی ماں نے دعا دی۔ خالہ لپک کر کرسی اٹھا لائی۔ میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے سامنے تپائی لا رکھی اس پر ہاتھ سے بنا ہوا رومال بچھایا۔ لالٹین کی لو اونچی کی اور کہنے لگی۔

''میں بھی کہوں' یہ سارا دن کوا کیوں بولتا رہا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تو آنے والا ہے۔''

''میں سہ پہر کو آ گیا تھا' ملنے ملانے اور کھانا کھانے میں دیر ہو گئی۔''

''ہائے مجھے کیا پتہ تھا کہ تو آیا ہے اگر مجھے پتہ چل جاتا تو میں نائیوں کی چھت پر کھڑے ہو کر تجھے ایک نظر دیکھ آتی۔''

اس نے لالٹین میرے قریب رکھ دی۔ پھر بولی''اب تو بڑا آدمی ہو گیا ہے نا۔۔۔۔۔۔مگر اڑیا۔۔۔۔۔۔فکر نہ کر۔۔۔۔۔۔ میں تجھے پیالے میں چائے نہیں دوں گی میں نے تیرے لئے چائے کا سیٹ خرید لیا ہے اور کئی مہینوں سے چائے کا بند ڈبہ منگا کر رکھا ہوا ہے۔ مجھے پتہ تھا تو ضرور آئے گا۔''

وہ مجھے بٹھا کر چائے بنانے لگی۔ ساتھ ساتھ گھر کے حالات اور خیریت پوچھتی رہی۔ بات بات پر خوش ہو کر کہتی ۔۔۔۔۔۔ ''میں تو ہر وقت دعا مانگتی رہتی ہوں اللہ تجھے اس سے بڑا عہدہ دے۔ میرا دل تو ہر وقت تیری یاد میں جلتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں تو نے بھی کبھی مجھے یاد کیا ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔۔اڑیا۔۔۔۔۔۔تو نے تو آج تک مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی نہیں دی۔ آپا ہم سے ناراض رہتی ہیں پر تجھے تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی بات کرنے کے قابل نہ چھوڑے مجھے اپنی بات شروع کر دینی چاہیے۔ میں نے کہا۔''میں تجھے یاد تو کرتا ہوں لیکن یہ یاد بڑی تلخ ہوتی ہے مجھے تمہارے حالات سن کر ندامت ہوتی ہے۔''

وہ چپ ہو گئی۔ اس کی بجائے اس کی والدہ نے جواب دیا۔''پتر' تو ٹھیک کہتا ہے۔۔۔۔۔۔تو سیانا ہے تو ہی اسے سمجھا ۔۔۔۔۔۔اس نے ہمارا دین اور دنیا دونوں خراب کر دیئے ہیں۔ کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے بھی موت آ جاتی۔''

''ماں جی''میں نے کہا''میں اسی مقصد کے لئے آیا ہوں۔ گاؤں والے آپ لوگوں کا حقہ پانی۔۔۔۔۔۔''

خالہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غراتی ہوئی میرے قریب آئی اور چیخنے کے سے انداز سے بولی۔''گاؤں والوں کو چھوڑ ۔۔۔۔۔۔تو اپنی کہہ''

میں سہم گیا۔

وہ بولی''میں سمجھتی تھی تو پڑھا لکھا ہے انصاف کی بات کرے گا مگر تو بھی۔۔۔۔۔۔''اس کی آواز بھرا گئی۔ آنسو پیتے ہوئے بولی۔''اس اجڑے گاؤں میں کیا کچھ نہ ہوا۔ یتیموں کی زمین لوگوں نے اپنے نام لگوا لی۔ قاتل دندناتے پھرتے رہے اور بے گناہ سولی چڑھ گئے۔ چوریاں' ڈاکے' شراب' جوا' اغوا۔۔۔۔۔۔مگر ایک ہمارا نکاح نہ ہوا۔ ہم نے والدین اور گاؤں والوں کی منتیں

کیں۔سائیں چپ شاہ کے مزار پر چراغ جلائے۔مولوی صاحب کے پاؤں پکڑے مگر انہوں نے کہا پنچایت نہیں مانتی۔۔۔۔۔۔ کیونکہ اس سے نئی رسم پڑنے کا ڈر ہے۔میں پوچھتی ہوں' کیا تو نے بھی یہی کچھ پڑھا ہے؟''

وہ بلند آواز میں رونے لگی۔

روتے روتے بولی۔''میں سوچتی تھی ایک دن تجھے خیال آئے گا۔تو آئے گا اور انصاف کرے گا مگر آج میری تمام امیدیں خاک میں مل گئی ہیں۔میرا سارا مان ٹوٹ گیا ہے۔''

وہ ہچکیاں لینے لگی۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے اور اس کے درمیان کھڑی ان دیکھے خوف کی دیوار بھی ہچکیاں لینے لگی ہے۔وہ دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر کو چھپائے دیر تک روتی رہی۔لگتا تھا اب کبھی چپ نہیں ہوگی۔

کسی انجانے خوف سے میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے اور دل و دماغ میں پٹاخے سے چلنے لگے۔پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ دیوار جس سے لپٹ کر وہ برسوں سے گریہ کر رہی ہے اس کے آنسوؤں سے آہستہ آہستہ کھرنے لگی ہے۔

◆◆◆

پھانس

''خیر تو ہے...... کیا ہوا؟''

'' کچھ نہیں''

'' کچھ تو ہے ورنہ تمہارے اندر تو ہر وقت بہت سی ہنسی جمع رہتی تھی۔''

''اس دور میں اتنا ہنس لینا بھی غنیمت ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم ہنستے ہنستے اچانک اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئے؟''

''لطیفہ اچھا تھا......!''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اتنے اچھے لطیفے پر اتنی مختصر ہنسی''

''آئندہ تم ہر لطیفے کے ساتھ وقت بھی بتا دیا کرو کہ اس پر اتنے منٹ ہنسنا ضروری ہے۔''

''بتا دیا کروں گا...... فی الحال تم بتاؤ کہ بات کیا ہے؟''

''کونسی بات...... کیسی بات؟''

''دیکھو...... مجھ سے جھوٹ مت بولو...... کوئی بات ضرور ہے ورنہ تم ہنستے ہنستے اس طرح اچانک سنجیدہ ہو جاتے۔ سچ اس لمحے تم مجھے بہت ہونق نظر آئے''

''یار اگر کوئی بات ہوتی تو میں تم سے چھپاتا؟''

''آج چھپا رہے ہو''

''کوئی خاص بات نہیں ہے''

''چلو عام سی بات ہو گی...... تم بتاؤ تو''

''عجیب سی بات ہے''

''پھر تو بڑا مزہ آئے گا''

''یار آج دن بھر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مجھے محسوس ہوتا رہا کہ میرے دل پر کسی ناخوشگوار بات کا بوجھ ہے۔ میں نے بہت غور کیا مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ ایسی کونسی بات ہوئی ہے۔اب میں تمہیں کیا بتاؤں؟''

''یار کچھ پلے نہیں پڑا...... ذرا اپنی بات کی وضاحت کرو''

''میں کہہ رہا تھا کہ دن بھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوتا رہا کہ میں کسی وجہ سے کچھ ملول سا ہوں۔ میرے دل پر کوئی بوجھ سا ہے۔کوئی اندیشہ۔کوئی چبتا سی۔اور جیسے آنکھ میں کوئی ذرہ پڑ جائے تو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی رڑک محسوس ہوتی رہتی ہے بالکل ایسے ہی میں دن بھر سارے کام معمول کے مطابق کرتا رہا مگر وہ جو ایک نامعلوم سا بوجھ میرے دل پر تھا وہ مجھے گاہے گاہے اداس کرتا رہا۔مگر مجھے ایسا کوئی واقعہ یا خبر یاد نہیں ہے جس کی وجہ سے ناگواری کا احساس میرے ذہن سے چمٹ گیا ہے البتہ مجھے اندازہ ہے کہ یہ پریشانی نہایت معمولی نوعیت کی ہے اور اس کا سبب بھی کوئی نہایت معمولی سا واقعہ یا بات ہے۔''

''یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''یوں...... کہ اگر کوئی غیر معمولی بات ہوتی تو مجھے یاد رہتی''

''پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟''

''ہاں کئی بار...... کوئی اچھی یا بری خبر...... جس کی نوعیت معمولی ہو مجھے خفیف سا خوش یا اداس کر کے میرے ذہن سے اتر جاتی ہے۔ مجھے تھوڑے وقفے کے بعد خوشگواریت یا ناگواریت کا احساس ہوتا رہتا ہے مگر یہ یاد نہیں آتا کہ میں کیوں خوش یا ناخوش ہوں؟''

''پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہوتا ہے؟''

''میں بھولی ہوئی اس بات یا واقعہ کو یاد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں' مگر ذہن اور الجھتا چلا جاتا ہے بعض اوقات کوئی بڑی پریشانی یا ذہنی مصروفیت مجھے اس معمولی قسم کی الجھن سے چھٹکارا دلا دیتی ہے مگر پھر کسی روز بیٹھے بٹھائے یا چلتے پھرتے وہ بھولی ہوئی بات جس نے مجھے اتنی دیر تک پریشان رکھا خود بخود یاد آ جاتی ہے' مگر اس کی نوعیت بعض اوقات اس قدر معمولی ہوتی ہے کہ اپنے آپ پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔''

''مثلاً''

''مثلاً...... ایک روز مطالعہ کے دوران مجھے کسی لفظ کے بارے میں شک ہوا کہ میں اب تک اس کو جن معنوں میں استعمال کرتا رہا

ہوں وہ شاید درست نہیں تھے۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور اتفاق سے میرے کمرے میں ڈکشنری نہیں تھی۔ سوچا صبح اٹھ کر ڈکشنری دیکھ لوں گا مگر صبح ہوئی تو مجھے یہ تو بھول گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے مگر کسی کمی کا احساس یا یوں سمجھو کہ ایک ناگوار سا خیال مسلسل ذہن سے چمٹا رہا اور تھوڑی دیر بعد دل میں کانٹا سا چبھتا رہا اور یہ صورت اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ پھر کبھی مطالعہ کے دوران وہی لفظ سامنے نہ آیا اور اس کے معانی جان کر میں نے اپنا شک دور نہ کر لیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں بھول جانے کی عادت ہے"

"نہیں...... اتنی سادہ سی بات مت سمجھو...... تمہیں معلوم ہے کہ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ میں جس شخص سے ایک بار مل لیتا ہوں اور اس کے جتنے کوائف میرے علم میں آتے ہیں وہ میرے ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پرانا ریکارڈ کھنگالنے کی بجائے دفتر والے مجھ سے رجوع کرتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے کے یاد کیے ہوئے سنیں' تاریخیں' حسابی گر' الجبرے کے فارمولے' جیومیٹری کے پرابلمز یہاں تک کہ سارے پہاڑے پوری طرح یاد ہیں حالانکہ ان چیزوں کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ بعض اوقات مجھے اتنی چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتیں یاد رہ جاتی ہیں کہ سننے والے اور جاننے والے ششدر رہ جاتے ہیں۔"

"ہاں اس کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ یاد ہے وہ علی احمد والا کیس۔ اگر تمہیں وہ سارے حوالے یاد نہ ہوتے تو مارا گیا تھا بے چارہ ...... مگر سوال یہ ہے کہ تمہاری موجودہ الجھن کا سبب کیا ہے"

"کوئی خاص بات نہیں ہو گی...... تم فکر نہ کرو...... خود ہی یاد آ جائے گی"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب میرا مسئلہ یہ ہے کہ جب تک تم اپنی الجھن کا سبب نہیں جان لیتے میں ایک الجھن کا شکار رہوں گا"

"حد ہو گئی...... اچھا تو پھر کیا کریں؟"

"تم میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ...... ابھی مسئلہ حل ہو جائے گا"

"تم نے اسے کھیل سمجھ لیا ہے...... مگر خیر...... پوچھو"

"تمہاری موجودہ کیفیت کب سے ہے"

"میرے خیال ہے صبح سے یا شاید کل سے"

"کل دفتر میں کوئی ناخوشگوار واقعہ تو پیش نہیں آیا۔ یاد کرو"

''اور تو کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ البتہ ایک چٹھی اوپر سے آئی تھی جس میں ایک غلط کیس کی سفارش کرنے کو کہا گیا تھا۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''وہی جو ایسی صورت میں کیا جاتا ہے حکم عدولی بھی نہ ہو اور غلط بات کی سفارش بھی نہ کی جائے۔ گول مول سا جواب لکھ دیا لیکن اس بارے میں میرے دل پر اب کوئی بوجھ نہیں ہے''

''کوئی اور چٹھی؟ جس کے مندرجات سے تمہیں اتفاق نہ ہو؟''

''ہاں وہ ایک لیٹر تھا۔ پندرہ تاریخ تک رپورٹ بھجوانی تھی اور یہ کل بیس تاریخ کو مجھ تک پہنچا۔ رپورٹ کے لیے تین دن درکار تھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس پر سخت سا جواب لکھ کر جی ہلکا کر لیا''

''کوئی سرکلر؟''

''ہاں وہ سرکلر...... وہی جس کا میں نے ٹیلی فون پر تم سے ذکر کیا تھا۔ یقین جانو میرا خون کھول اٹھا۔ سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بس اسی طرح ٹھونستے رہتے ہیں اور پھر اس میں میری ذاتی پریشانی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔''

''دفتر میں کسی سے تلخ کلامی ہوئی ہو؟''

''تم میری طبیعت سے واقف تو ہو''

''کوئی ٹیلی فون کال؟''

''نہیں''

کوئی آدمی ملنے آیا ہو دفتر میں...... یا تم کہیں گے تھے؟''

''وہ لڑکا آیا تھا...... کمپاؤنڈر...... جس نے ریکروٹنگ ایجنٹ کے پاس پیسے جمع کرائے تھے ویزا کے لیے......''

''یار وہ تو میری ذمہ داری بھی ہے''

''بلکہ تمہاری ہی ہے۔ میں تو کہتا رہا کہ اس جھمیلے میں نہ پڑیں''

''کیا کہتا تھا؟''

''کہتا تھا اگر ویزا نہیں ملتا تو اس کی رقم واپس دلائی جائے۔ اب وہ کم بخت رقم کہاں لوٹاتا ہے''

''تو تم نے بات کی اس سے''

''ہاں کی تھی...... وہی سال بھر پہلے والا جواب کہ جلد ہی ویزا آ جائے گا''

''تو تمہاری پریشانی کی وجہ یہ بھی نہیں''

''ہے تو سہی...... مگر وہ کوئی دوسری بات ہے اس سے زیادہ اہم جو مجھے یاد نہیں آ رہی'' ''گھر میں...... میرا مطلب ہے بھابی سے تو جھگڑا نہیں ہو گیا تھا؟''

''ہوا تھا مگر وہ تو پرسوں کی بات ہے''

''کیوں...... کیا ہوا تھا؟''

''وہی جو بیویوں کی عادت ہوتی ہے فلاں کے گھر فلاں چیز آئی ہے۔فلاں کے میاں نے گاڑی خرید لی ہے۔یہ لا دیں...... وہ لا دیں۔''

''پھر؟''

''پھر صلح ہو گئی...... تم کوئی دوسرا سوال کرو''

''کوئی خواب دیکھا تم نے؟''

''خواب؟''

ہاں خواب۔کوئی ڈراؤنا۔بھیانک خواب۔اپنے یا کسی عزیز کے بارے میں؟''

''نہیں''

''پھر یقیناً تمہیں کسی کی یاد نے ستایا ہوگا...... وہ کیا نام تھا ان صاحب کا جو بیاہ کر لندن چلی گئی تھیں' ہاں فرزانہ......''

''ہاں یار کل شب کو ریڈیو سے اس فلم کے نغمے نشر ہو رہے تھے جو ہم دونوں نے اس شام دیکھی تھی جب ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے تھے۔مگر ایسا تو اکثر ہوتا رہتا ہے۔ہم نے جو فلمیں ایک ساتھ دیکھی تھیں جو گانے ایک دوسرے کی موجودگی میں سنے تھے یا اسے پسند تھے وہ جب بھی سنتا ہوں تو اس کی یاد آتی ہے اور پھر میری پریشانی تو یہ ہے کہ میں کچھ بھول گیا ہوں فرزانہ کو تو میں نے کبھی نہیں بھلایا...... تم بے فکر ہو کر اگلا سوال پوچھ سکتے ہو۔''

''اچھا یہ بتاؤ...... تم نے کل اخبار پڑھا تھا''

''روز ہی پڑھتا ہوں''

''اس میں ہوائی جہاز کے حادثے کی خبر چھپی تھی جس میں سینکڑوں آدمی ہلاک ہو گئے اور وہ ویگن اور ٹرک کی ٹکر کی خبر بھی تو شاید کل ہی چھپی تھی؟''

''ہاں یار...... میں نے دونوں خبریں پڑھی تھیں۔ بہت افسوس ہوا۔ اس سال بہت حادثے ہوئے ہیں''

''حادثے سے مجھے یاد آ گیا...... وہ تمہارا یار نذیر لنگڑے کا کیا حال ہے؟''

''ہاں یار...... کل اس کا خط آیا تھا''

''کل آیا تھا...... تو پھر تم ضرور اسی کے بارے میں فکر مند ہو گے...... کیا کوئی بری خبر تھی اس میں؟''

''نہیں...... بہت خوشی کی خبر تھی...... وہ مقدمہ جیت گیا ہے''

''اچھا...... اس کا مطلب ہے اب ساری زمینیں اور جائیداد اسے واپس مل جائیں گی؟''

''یقینا''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اسی لیے کہتے ہیں خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اسے مبارکباد کا تار دینا چاہیے۔ مگر تم نے اتنی بڑی خبر مجھے اب تک کیوں نہیں بتائی؟''

''بس یار میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔''

''لیکن یہ تمہارے چہرے پر اطمینان بھری اداسی کیوں پھیل گئی ہے کیا تمہیں اپنی پریشانی کا سبب یاد آ گیا ہے؟''

''نہیں تو''

''اس ساری گفتگو میں تم پہلی بار جھوٹ بول رہے ہو لیکن کوئی بات نہیں۔ میں خوش ہوں کہ تمہیں یہ تو پتہ چلا کہ تمہاری اداسی کی اصل وجہ کیا تھی۔ خدا حافظ۔''

''خدا حافظ''



انجن کے بغیر گاڑی کا مسافر

اگرچہ ڈبے کے اندر...... باہر کی نسبت زیادہ اندھیرا ہے مگر اندر داخل ہو کر وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ اب اس کا پیچھا ...... اس سے چھوٹ جائے گا جو اسے ہر کہیں نظر آتا اور پریشان کرتا رہتا ہے۔ وہ اندھیرے میں ٹٹول کر ایک خالی سیٹ تلاش کرتا اور اس پر دراز ہو جاتا ہے۔ دور سے انجن کی سوں سوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر شاید گارڈ وسل دیتا ہے یا روشنی دکھاتا ہے وہ سن یا دیکھ نہیں سکا مگر گاڑی کو کھینچنے کے لیے انجن کی جو چیخیں سی نکل رہی ہیں وہ صاف سنائی دیتی ہیں۔ گاڑی کے حرکت میں آتے ہی ڈبہ روشن ہو جاتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ پورا ڈبہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور اس سیٹ کے سوا جس پر وہ لیٹا ہے کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں...... کچھ لوگ سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے سامان اٹھائے سیٹوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ ایک نوجوان جوڑا جن کی نئی نئی شادی ہوئی لگتی ہے اس کے قریب ہی کھڑا حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ نوجوان کچھ کہنا چاہتا ہے مگر شاید اس کے قیمتی لباس اور پروقار شخصیت سے مرعوب ہو کر اسے ہمت نہیں ہو رہی۔ وہ دل ہی دل میں نوجوان کی بزدلی پر ہنستا اور لطف اندوز ہوتا ہے پھر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور ان کے لیے جگہ بناتا ہے۔ لڑکی تشکر کی اچٹتی ہوئی ایک میٹھی نظر اس پر ڈالتی اور نوجوان کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ جاتی ہے اور ابھی وہ لڑکی کی تشکر آمیز میٹھی نظر کو جو لوگوں کی بھیڑ میں کھو گئی ہے تلاش کر رہا ہوتا ہے کہ وہ...... ہاتھوں کے بل چلتا اور گھٹتا ہوا ڈبے میں داخل ہوتا ہے۔

''اللہ کے نیک بندو...... میں غریب محتاج...... دونوں ٹانگوں سے معذور آنے دو آنے کا سوال ہے۔''

وہ غصے اور نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے وہ سننا نہیں چاہتا...... وہ یہ الفاظ سن سن کر تھک گیا ہے اسے اس کی صدا کے یہ الفاظ نہ صرف ازبر ہو گئے ہیں بلکہ اس کی زبان پر چڑھ گئے ہیں اور اکثر بے خیالی میں ادا ہو جاتے ہیں۔ کل چوک میں سے گزرتے ہوئے زیبو نے اس سے پوچھا ''کہاں جا رہے ہو؟'' تو اس کے منہ سے نکل گیا ''آنے دو آنے کا سوال ہے۔''

اسے غصہ آ جاتا ہے اس کا جی چاہتا ہے کہ اسے اٹھا کر چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دے۔ مگر وہ رینگتا ہوا ہاتھ کے پنجوں کے بل چلتا دوسرے ڈبے میں چلا جاتا ہے اور وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

''کھانا گرم...... چائے گرم'' بیرے کی آواز سنائی دیتی ہے

اسے یاد آتا ہے اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بیرے کی آواز سن کر اس کے اندر اونگھتی ہوئی بھوک اٹھ کر بیٹھ جاتی اور ضد کرنے لگتی ہے۔ وہ بیرے کو کھانا لانے کا آرڈر دیتا ہے۔ بیرا فوراً کھانا لے آتا ہے اور وہ بریانی میں مرغ کا شوربہ ملا کر کھانے لگتا ہے مگر ابھی اس نے ایک ہی چمچہ منہ میں ڈالا ہے کہ اس کی آواز پھر سنائی دیتی ہے۔

''اللہ کے نیک بندو...... میں غریب محتاج...... دونوں ٹانگوں سے معذور''

وہ چمچہ ٹرے میں رکھ کر ہاتھ سے اپنی ٹانگوں کو ٹٹول کر دیکھتا ہے پھر مطمئن ہو کر بریانی کھانے لگتا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد وہ ہاتھ منہ صاف کرنے چلا جاتا ہے مگر واپس آ کر کیا دیکھتا ہے کہ اس سیٹ پر کٹی ہوئی ٹانگوں والا وہ ...... بیٹھا اپنے غلیظ ہاتھوں سے جلدی جلدی بچا کھچا کھانا کھا رہا ہوتا ہے۔

''غلیظ...... ندیدہ...... کمینہ'' وہ غصے سے کہتا ہے مگر وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ دانت نکال کر اس کی طرف دیکھتا ہے پھر زبان سے پلیٹ چاٹنے لگتا ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا وہ اس مکروہ شخص سے کیسے پیچھا چھڑائے۔ لمحہ بھر کے لیے سوچتا ہے پھر لپک کر اگلے ڈبے میں چلا جاتا ہے۔ اگلے ڈبے کے لوگ اس کی وضع قطع اور اس کے لباس کو دیکھ کر اس کے لیے جگہ بناتے ہیں ایک بزرگ اسے اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں اور نہایت اپنائیت سے پوچھتا ہیں'' آپ کو کہاں جانا ہے؟''

''میں...... مجھے'' وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسے کہاں جانا ہے لیکن ابھی تک اس کم بخت کی وجہ سے اس کا ذہن کام نہیں کر رہا' اسے فوراً یاد نہیں آتا کہ اسے کہاں جانا ہے مگر پوچھنے والے کو مطمئن کرنے کے لیے کہتا ہے

''جہاں تک گاڑی جائے گی''

''اچھا اچھا...... پھر تو آپ کا سفر خاصا طویل ہے''

''ہاں بہت طویل ہے'' وہ کہتا ہے

''آپ نے برتھ کی ریزرویشن کرا لی ہوتی''

''جوان آدمی ہیں...... بیٹھ کر بھی سفر کر سکتے ہیں''

''میں کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں...... ایک بیٹا ڈاکٹری پڑھ رہا ہے دوسرا دوبئی میں انجینئر ہے۔ آپ کیا کرتے ہیں؟''

اس کی سمجھ میں نہیں آتا' کیا جواب دے۔ اسے خود یاد نہیں آ رہا کہ وہ کیا کرتا ہے اور شاید ذہن پر زور دینے سے اسے یاد آ جاتا مگر وہ

اپنی کٹی ہوئی ٹانگیں گھسیٹتا اس کے پیچھے پیچھے اس ڈبے میں بھی آجاتا ہے اور اس کے ذہن کو اپاہج کر دیتا ہے۔

''الو کا پٹھا'' وہ دل ہی دل میں گالی دیتا ہے۔

''اللہ کے نیک بندو۔''

''میں غریب محتاج'' وہ اس کی نقل اتارتا ہے

''صاحب بھک منگے بہت ہو گئے ہیں''

''جی ہاں...... انہوں نے شریف لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے''

''سنا ہے بڑے مالدار ہوتے ہیں یہ مانگنے والے''

''خیر مالدار کیا ہوں گے صاحب...... بس ہڈ حرامی ہے''

''نہیں صاحب...... محض ہڈ حرامی نہیں بڑی کمائی کرتے ہیں یہ لوگ۔ اب اس لولے کو لیجئے آپ کے خیال میں اس کی روزانہ آمدنی کیا ہو گی؟''

''پانچ سات روپے'' اسے پتہ نہیں چلتا کہ اس نے کیوں اور کب جواب دیا ہے۔

''پانچ سات نہیں صاحب...... پچاس ساٹھ کہئے''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں...... یہ لوگ فلمیں دیکھتے' اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے اور چرس افیون کا نشہ کرتے ہیں۔ بعض شہروں میں تو ان کے نہایت منظم گروہ ہیں۔ وہ ٹیلی ویژن پر آپ نے ڈرامہ نہیں دیکھا؟''

اس سے رہا نہیں جاتا...... کہتا ہے

''دوسروں کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا مگر اس کا تو مشکل سے گزارہ ہوتا ہے''

''آپ اسے جانتے ہیں؟''

''ہاں'' وہ انکار نہیں کر سکتا ''یہ کئی برسوں سے گاڑیوں میں بھیک مانگتا پھرتا ہے اور مشکل سے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے''

''بیوی بچے؟''

''ہاں...... پہلے اس کی ٹانگیں سلامت تھیں''

''پھر؟''

''پھر وہ مشین میں آ کر کٹ گئیں۔ اس کے بعد اس نے گاؤں جانا چھوڑ دیا۔ ان کھیتوں کو دیکھ کر جن کے کنارے وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا اور ان تالابوں کو دیکھ کر جن میں وہ تیرا اور نہایا کرتا تھا اسے اپنے اپاہج ہونے کا احساس شدید ہو سکتا تھا۔ شروع میں اس کی بیوی تھوڑے تھوڑے عرصے بعد بچوں کو ملانے کے لیے اس کے پاس لے آتی تھی مگر اب یہ وقفے طویل ہوتے جا رہے ہیں اور وہ انہیں دیکھنے کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ لیکن اس کی بیوی شاید ٹھیک ہی کہتی ہے۔ بچے اب بڑے ہو گئے ہیں اور باپ کو اس حال میں دیکھ کر ان پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔''

''صاحب معاف کیجئے گا...... آپ کو اتنی بہت سی باتوں کا کیسے پتہ چلا؟''

''میں'' وہ کوئی جواب سوچنا چاہتا ہے مگر یہ دیکھ کر گھبرا جاتا ہے کہ سب لوگ اسے شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک آدمی دوسرے کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ وہ سن تو نہیں سکا مگر سمجھ جاتا ہے۔ کالے چشمے والا آدمی جو کسی سرکاری دفتر میں بڑے عہدے پر فائز معلوم ہوتا ہے چشمہ اتار کر اس کی طرف گھورتا چلا جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے

''صاحب...... معاف کیجئے آپ دونوں کی شکل بہت ملتی ہے!''

وہ اور گھبرا جاتا ہے۔ اسے اسی بات کا خدشہ تھا۔ نفرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے ''شکل اس قدر ملتی ہے کہ لگتا ہے جیسے جڑواں بھائی ہوں''

اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر آواز اس کے گلے میں پھنس جاتی ہے۔

اچانک قریب سے دوسری گاڑی گزرتی اور وسل سنائی دیتا ہے۔

اس کی آنکھ کھل جاتی ہے

کیا دیکھتا ہے کہ دن نکل آیا ہے۔ وہ حسب معمول یارڈ میں کھڑے پرانے ڈبے سے نکل کر پنجوں کے بل چلتا پلیٹ فارم کی طرف چل پڑتا ہے۔



کیلنڈر

اس کے اندر اتنے زور کا بادل گرجتا ہے کہ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور بار بار بجلی کوندتی ہے۔ پتائی سے گھڑی اٹھا کر اس کی اندھیرے میں چمکتی ہوئی سوئیاں دیکھتا ہے۔ نصف رات بیت چکی ہے۔ مگر نئے دن کا سورج طلوع ہونے میں ابھی بہت وقت ہے۔ کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے۔ ہر سو گھپ اندھیرا ہے۔ جب بجلی کوندتی ہے تو لحظہ بھر کے لیے درخت' بجلی کے کھمبے اور صحن کی دیواریں روشن ہو جاتی ہیں مگر پھر پلک جھپکتے ہی تاریکی میں ڈوب جاتی ہیں۔ کھڑکی سے ٹھنڈی اور بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔ وہ دوبارہ سو جانا چاہتا ہے مگر کسی انجانے دکھ کا احساس اسے پریشان اور بدمزہ کر دیتا ہے۔ وہ ذہن پر زور دیتا ہے کہ اس دکھ کی نوعیت یاد آ جائے جس نے آنکھ کھلتے ہی اسے دبوچ لیا ہے مگر اسے بالکل یاد نہیں آتا۔

کچھ عرصہ سے بھول جانے کا مرض کافی بڑھ گیا ہے اس نے کئی بار سوچا ہے کہ کسی ماہر معالج سے رجوع کرے مگر ہر بار وہ بھول جاتا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ اب اسے معالج سے مشورہ کرنے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے بلکہ کل ہی مشورہ کرنا چاہیے وہ آنے والا دن اور تاریخ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ گھڑی سے دن اور تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اندھیرے کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتا کیلنڈر کی طرف دیکھتا ہے اندھیرے کی وجہ سے کیلنڈر بھی صاف پڑھا نہیں جاتا۔ اٹھ کر بتی جلاتا ہے مگر بتی نہیں جلتی۔ اسے یاد آتا ہے کہ جب بھی تیز بارش ہوتی ہے بجلی چلی جاتی ہے وہ ماچس جلا کر کیلنڈر پڑھتا ہے اسے تاریخ یاد آ جاتی ہے مگر وہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ اس تاریخ کے گرد پہلے سے دائرہ بنا ہوا ہے۔ ذہن پر بہت زور دیتا ہے کہ اس نے کب اور کیوں یہ دائرہ لگایا مگر اسے بالکل یاد نہیں آتا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس تاریخ کی کیا اہمیت ہے پتہ نہیں اگلے روز سوئی گیس' بجلی یا ٹیلیفون کے بل جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے یا کسی لائسنس کی تجدید کرانے کی۔ اسے کسی سفر پر روانہ ہونا ہے یا کسی مقدمے کی پیروی کرنی ہے۔ کیا پتہ کسی مہمان کے آنے کا دن ہو یا شہر میں کوئی اہم تقریب ہو رہی ہو؟ مگر اس سے پہلے اس نے کبھی کسی تاریخ کے گرد دائرہ نہیں لگایا تھا یقیناً یہ کوئی نہایت ہی اہم بات تھی مگر کیا؟ اسے کچھ یاد نہیں آتا۔

وہ اٹھ کر سگریٹ سلگاتا ہے اور لمبے لمبے کش لے کر کھانسنے اور سوچنے لگتا ہے۔

یہ اس کا برتھ ڈے بھی نہیں ہے۔ کسی بچے کی تاریخ پیدائش ہے نہ کسی رشتہ دار کی برسی۔ اسے یاد آتا ہے کہ رات جب وہ سونے لگا

تھا تو اس کی نگاہ ہر روز کی طرح کیلنڈر پر پڑی تھی اور کیلنڈر پر یہ دائرہ بالکل موجود نہیں تھا۔ اس کی ساری توجہ اسی ایک نکتے پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ یہ دائرہ کب' کیوں اور کس نے لگایا؟ اگر یہ دائرہ اس نے خود لگایا ہوتا تو آتے جاتے وہ کام جو اسے اس تاریخ کو سرانجام دینا تھا ضرور یاد آتا رہتا۔ لیکن اگر یہ دائرہ رات سونے سے پہلے کیلنڈر پر موجود نہیں تھا تو پھر کہاں سے آ گیا؟ گھر کے سب لوگ پہاڑ پر گئے ہوئے تھے اور گھر میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پھر دروازہ بند تھا اور اگر دروازہ بند نہ بھی ہوتا تو کیا کوئی اس کے کمرے میں محض تاریخ کے گرد دائرہ لگانے کے لیے گھس آتا؟ اور کیوں؟

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ کہیں اس نے سوتے میں اٹھ کر خود ہی یہ حرکت نہ کی ہو مگر اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی اسے نیند میں چلنے کی عادت ہے پھر یہ دائرہ؟ اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ اس خواب کا تعلق اس تاریخ سے ہو۔ اسے خواب بہت آتے تھے مگر اکثر بھول جاتے تھے۔ دن کو چلتے پھرتے دفتر یا گھر کا کام کرتے ہوئے خواب سے مماثل کوئی صورت حال یا خواب میں دیکھا ہوا کوئی شخص مل جاتا تو لمحہ بھر کے لیے اسے خواب کا متعلقہ حصہ یاد آ جاتا پھر فوراً ہی ذہن سے اتر جاتا۔ وہ خواب یاد کرنے لگتا ہے مگر اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ وہ بچپن سے لے کر اب تک اپنے ماضی کے سارے اہم واقعات اور حادثات کو ذہن میں لا کر تجزیہ کرتا ہے شاید اسے کسی ایسی بات کا سراغ مل جائے جس کا تعلق اس تاریخ سے ہو مگر اسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اسے نیند میں چلنے کی بیماری لگ گئی ہے اور اس نے خود ہی نیند میں اٹھ کر کیلنڈر پر دائرہ لگایا ہے ...... وہ اپنے شک کی تصدیق کے لیے دوبارہ دیا سلائی جلا کر کیلنڈر کے قریب آتا ہے اور یہ جان کر ششدر رہ جاتا ہے کہ جس رنگ کی سیاہی سے وہ دائرہ لگا ہوا ہے اس رنگ کی سیاہی اس کے قلم میں نہیں ہے۔ پھر یہ دائرہ کب' کیوں اور کس نے لگایا اس کی حیرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سر کو ہاتھوں سے تھام کر بستر پر دراز ہو جاتا اور سوچنے لگتا ہے۔

وہ حیرت سے کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔

یہ وہ کمرہ نہیں ہے جہاں وہ رات کو سویا تھا اور جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے تک موجود تھا لیکن کمرہ جانا پہچانا ہے اسے اس سے مانوسیت کی ایسی خوشبو آتی ہے جیسے اپنے جسم کے پسینے سے آیا کرتی ہے۔ اچانک وہ چونک پڑتا ہے یہ تو وہی کمرہ ہے جہاں برسوں پہلے وہ اسے چھوڑ کے چپکے سے چلا آیا تھا۔ وہ حیرت سے چیزوں کو دیکھتا ہے سب کچھ ویسا ہی ہے۔ کھڑکیوں کے پردے ...... فرنیچر ...... گدیوں کے غلاف ...... میز پوش ...... ٹیبل لیمپ ...... ریڈیو ...... گلدان میں وہی پھول سجے ہیں جو

دونوں نے اس شام فلم دیکھ کر لوٹتے ہوئے خریدے تھے۔ وہ ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھتا ہے گیلے جوتوں کے نشانات بتاتے ہیں کہ وہ ابھی ابھی بارش میں بھیگتا اس کمرے میں داخل ہوا ہے۔ دیوار پر کیلنڈر موجود ہے مگر اس کا ڈیزائن اور سائز اس کیلنڈر سے مختلف ہے جو تھوڑی دیر پہلے اس نے اپنے اس کمرے کی دیوار پر دیکھا تھا جہاں وہ برسوں سے رہتا' سوتا جاگتا اور زندگی گزارتا ہے۔ وہ کیلنڈر کو غور سے دیکھتا اور دنگ رہ جاتا ہے بوسیدگی سے نا آشنا وہ تیس برس پہلے کا کیلنڈر ہے مگر اسی تاریخ کے گرد اسی رنگ کی سیاہی سے دائرہ بنا ہوا ہے جیسا اس نے اپنے کمرے کے کیلنڈر پر دیکھا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ وہ اپنے اسی کمرے میں جہاں وہ برسوں سے زندگی گزار رہا ہے سویا پڑا ہو اور یہ سب کچھ خواب کی حالت میں دیکھ اور محسوس کر رہا ہو۔ کیا پتہ تیس برس بعد اس کے اندر یادوں کا بادل اتنے زور سے گرجا ہو کہ اس کی آنکھ برسوں پہلے کے زمانے میں جا کھلی ہو۔ مگر وہ کہاں ہے؟ اس کے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش نشتر چبھونے لگتی ہے۔ اسی لمحے غسل خانے کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ بالکل وہی برسوں پہلے کا لباس پہنے اور وہی تولیہ سر پر لپیٹے باہر آتی ہے اور اس کی طرف دیکھے بغیر سنگھار میز کے سامنے بیٹھ جاتی اور کنگھی کرنے لگتی ہے وہ حیران رہ جاتا ہے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا وہ بالکل ویسی ہی ہے تر و تازہ اور جوان۔ لگتا ہے اس کی عمر میں ایک دن کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے۔

''کون؟''

اس کی آواز میں وہی نوخیزی اور ترنم ہے

''میں ہوں'' وہ جواب دیتا ہے ''تم نے مجھے پہچانا نہیں؟''

وہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھتی ہے

''کون ہیں آپ؟''

''میں...... میں ہوں'' وہ پریشان ہو جاتا ہے۔

اور جس طرح ہوا تھم جائے تو پانی کی سطح پر تیرتی موجیں جھٹ لیٹ جاتی ہیں اس کی پیشانی پر پڑے ہوئے بل ہموار ہو جاتے ہیں اور وہ حیرت اور خوشی سے چیخ پڑنے کے انداز میں پوچھتی ہے۔

''ارے آپ؟''

''ہاں میں'' وہ کہتا ہے ''میں شرمندہ ہوں' یقین جانو' میں زندگی بھر پشیمان رہا'' وہ اداس ہو جاتی ہے لگتا ہے جذبات پر قابو پانے

کے لیے تگ ودو کر رہی ہے اسے اس کے اندر ٹپ ٹپ آنسو گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے مگر اس سے پہلے کہ ضبط کی برسوں لمبی سسکی کا گولہ ادھڑنا شروع ہو جائے وہ اپنے مخصوص دلربا تبسم کی چادر پھر سے اوڑھ لیتی ہے اور کہتی ہے

''یہ آپ نے بڑھاپے کا سوانگ کیوں بھارا ہے؟''

''یہ سوانگ نہیں حقیقت ہے''

''شاید تیس برس بعد آپ ایسے ہی نظر آئیں گے''

''نظر آؤں گا نہیں'' وہ کہتا ہے ''تیس برس بعد ایسا نظر آ رہا ہوں''

''بھی کیا مذاق ہے...... ہٹایئے...... میرا دل خراب ہوتا ہے''

''یہ مذاق نہیں ہے۔ میں تیس برس کی ازدواجی زندگی گزار کر آ رہا ہوں''

''وہ کیسے؟'' وہ حیرت سے پوچھتی ہے ''کس کے ساتھ؟''

''بھئی تم جانتی تو ہو...... وہی تمہاری کولیگ' چودھری علی محمد کی بیٹی سے میری شادی ہو گئی تھی...... اس سے میرے بہت سے مسائل حل ہو گئے تھے۔ صرف ایک مسئلہ'' ''آپ پھر مذاق کرنے لگے'' وہ اس کی بات کاٹ کر کہتی ہے

''ایسا نہیں ہو سکتا''

''ایسا ہوا...... اس سے میرے بہت سے بچے ہیں اور تمہاری شادی بھی تو ہو گئی تھی؟''

''میری شادی؟''

''ہاں...... میں نے سنا ہے کہ تمہارے بچے بہت ہونہار ہیں اور تمہاری بیٹی کی شکل تم سے بے حد ملتی ہے''

وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے' ہنسے چلی جاتی ہے اس کی ہنسی کی آواز ویسی ہی خوبصورت اور دلکش ہے جیسی ہوا کرتی تھی۔ ہنسی کا دورہ تھمتا ہے تو وہ سنجیدہ ہو کر کہتی ہے ''مجھے سب معلوم ہے''

''کیا معلوم ہے؟''

''یہی کہ آپ مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آپ کے کیلنڈر سے ایک تاریخ چوری ہو گئی ہے اور آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا اس تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ اس کی گمشدگی میں مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو...... تاریخ کیسے چوری ہوسکتی ہے؟"

"آپ سب جانتے ہیں مگر آپ تلخ حقائق کا سامنا کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں آپ نے میرے ساتھ بھی یہی کچھ کیا تھا اور اب تاریخ کے سلسلے میں بھی آپ جان بوجھ کر سائیڈ ٹریک کر رہے ہیں"

"کیا تم مجھ سے بہت ناراض ہو؟"

اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے کھڑکی سے بارش کی بوچھاڑ اندر آرہی ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑکی بند کرتا اور بتی جلا کر پہلے گھڑی دیکھتا اور پھر کیلنڈر پڑھتا ہے اور یہ جان کر کہ وہ تاریخ جس کے گرد کیلنڈر پر دائرہ لگا ہوا تھا' آئے بغیر گزر چکی ہے۔ وہ سر پکڑ کر رہ جاتا ہے۔



ٹھوہر کا کانٹا

میں، ماموں جان اور وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں

میں، میں ہوں جس کے باپ نے خودکشی کر لی تھی یا شاید اسے زہر دے دیا گیا تھا (بعض لوگوں کا یہی خیال ہے)

اور ماموں جان...... اگرچہ میرے ماموں جان ہیں لیکن وہ میری اس ماں کے سگے یا سوتیلے بھائی نہیں ہیں جس نے حلالہ کرنے کے لیے مولوی عبدالصمد سے نکاح کر لیا اور پھر انہی کے پاس رہنے لگی۔ اس کا کہنا ہے کہ جب وہ طلاق لینا نہیں چاہتی تھی اسے طلاق مل گئی اور جب وہ طلاق لینا چاہتی ہے تو اسے طلاق نہیں مل رہی۔ مگر لوگوں کا خیال ہے کہ میرا باپ جس نے اسے طلاق دی تھی کمزور اور بیمار شخص تھا لوگ تو اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ میرا باپ مرتے دم تک یہی کہتا رہا کہ طلاق نہیں ہوئی تھی اور وہ کفارہ ادا کر کے رجوع کر سکتا تھا۔ ماں بھی یہی کہتی تھی مگر کچھ لوگوں نے گواہی دی کہ انہوں نے طلاق کے الفاظ تین بار سنے تھے۔ بعض دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ گواہی دینے والوں میں سے کوئی بھی موقع پر موجود نہ تھا۔

مجھے اپنی ماں سے شدید نفرت ہے اور اپنے باپ سے بھی۔ اس نے میری ماں کو اس وقت طلاق دی جب وہ اس کے بطن میں تھا اس طرح اس نے مجھے بھی طلاق دے دی تھی۔ اگر ماموں جان کا سہارا نہ ہوتا تو میں پرورش نہ پا سکتا۔ ماموں جان نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں نے ابھی ہوش نہیں سنبھالا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس گھر میں اٹھ آئے جہاں طلاق سے پہلے میرا باپ اور میری ماں ہنسی خوشی رہتے تھے اور جہاں انہوں نے میری داغ بیل ڈالی تھی۔

ماموں جان کے علاوہ ایک تیسرا شخص (اسے شخص کہنا گناہ ہے) بھی ہمارے ساتھ رہتا ہے اور صرف رہتا ہی نہیں مجھے پریشان بھی کرتا رہتا ہے۔ اگر ماموں جان کا سایہ سر پر نہ ہوتا تو وہ مجھے تباہ کر دیتا کیونکہ وہ...... ہے جس نے میرے باپ کے منہ سے طلاق کے الفاظ نکلوائے جس نے میری ماں سے میرے باپ کو زہر دلوایا اور جس نے میرے باپ کے باپ کو جنت سے نکلوایا تھا۔

وہ اعتراف نہیں کرتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ماموں جان سے بے حد ڈرتا ہے لیکن مجھے نا سمجھ جان کر ہر وقت دق کرتا رہتا ہے۔ خدا کا شکر ہے ماموں جان کی تربیت کی وجہ سے میں اسے خوب پہچانتا ہوں اور اس کی باتوں میں نہیں آتا لیکن کئی طرح کی دعائیں

مانگنے اور وظائف کرنے کے باوجود وہ ہمارے گھر کو چھوڑ کر نہیں جاتا۔ جب ماموں جان گھر پر ہوں تو وہ میرے اندر اور بھی دبک کر بیٹھ جاتا ہے میں ہمہ وقت اس پر لعنت بھیجتا رہتا ہوں اور اللہ سے اس کی پناہ مانگتا ہوں لیکن وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور میری عبادتوں اور ریاضتوں میں خلل ڈالتا ہے وہ مجھے نہایت دلکش اور بظاہر مضبوط دلیلوں سے قائل کر کے اپنی راہ پر لگانا چاہتا ہے اور تو اور اس نے مجھے ماموں جان کے خلاف بھڑکانے اور ان کے لیے میرے دل میں شک ڈالنے کی بھی بہت کوشش کی ہے۔ کہتا ہے کہ انہوں نے خدانخواستہ میری زمینوں اور جائیداد کی وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر میری سرپرستی قبول کی ہے اور وہ اس پر اسی طرح قابض رہیں گے مگر میں ماموں جان کو بہت قریب سے جانتا ہوں وہ نہایت نیک اور اللہ سے ڈرنے والے شخص ہیں انہوں نے میری خاطر اتنی بڑی قربانی دی ہے اور اپنے گھر بار سے دور رہ کر اتنے عرصہ سے میری پرورش اور تربیت کر رہے ہیں خدا کا شکر ہے کہ ان کی وجہ سے میرا ایمان پختہ ہے ورنہ اس مردود نے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ تاہم میں اس سے خوفزدہ رہتا ہوں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔

کبھی کبھی ماموں جان کی بتائی ہوئی دعاؤں اور وظیفوں کے طفیل وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلا بھی جاتا ہے مگر پھر دعاؤں اور وظائف کا اثر کم ہوتے ہی کسی نازک موقع پر دوبارہ آ دھمکتا ہے اور میرے دل و دماغ میں اپنی شرانگیزیاں شروع کر دیتا ہے۔ میں اس سے بحث و تکرار نہیں کرنا چاہتا اکثر اس کی باتوں کا جواب نہیں دیتا چپ چاپ اپنی اس راہ پر جو مستقیم ہے اور ان کی راہ ہے جن پر اللہ نے اپنی رحمتیں اور نوازشیں کیں چلتا رہتا ہوں مگر وہ اپنی ناپاک کاروائیاں جاری رکھتا ہے اور کئی کئی روز تک میرے دل کے تالاب میں گمراہی کی مچھلی پکڑنے کے لیے کانٹا ڈالے بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی جب میں اس سے زیادہ عاجز آ جاتا ہوں تو ماموں جان سے شکایت کرتا ہوں وہ کچھ پڑھ کر پھونکتے ہیں تو وہ میرا اندر ہی نہیں گھر بھی خالی کر کے چلا جاتا ہے مگر جونہی میں اکیلا ہوتا ہوں وہ کہیں نہ کہیں سے آ دھمکتا ہے اور مجھے تنگ کرنے لگتا ہے میں کہتا ہوں۔

''میں پناہ مانگتا ہوں اجلہ کی شیطان مردود سے''

وہ قہقہہ لگاتا اور بڑی ڈھٹائی سے کہتا ہے

''تمہاری دعا قبول نہیں ہو سکتی''

''کیوں نہیں ہو سکتی؟''

''اس لیے کہ میں تمہارے اندر موجود ہوں''

''تم دفعان کیوں نہیں ہو جاتے؟''

''اس لیے کہ تم نے خود مجھے اپنے اندر پناہ دے رکھی ہے''

''میں نے تمہیں پناہ نہیں دی۔تم زبردستی میرے اندر گھس بیٹھتے ہو...... دفعان ہو جاؤ...... میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں مردود''

''تم مجھے رد نہیں کر سکتے۔''

''کیوں نہیں کر سکتا؟''

''اس لیے کہ تم خود طلاق یافتہ ہو۔تمہیں تمہارے باپ نے پیدا ہونے سے پہلے عاق کر دیا تھا''

''میں اپنے باپ کی جائز اولاد...... اس کا وارث ہوں''

''تمہارے باپ کو تمہارے جائز ہونے میں شبہ تھا اسی لیے اس نے تمہاری ماں کو طلاق دی۔اسی لیے اس نے تمہیں کالعدم قرار دے دیا تھا''

''میں کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ میں ہوں''

''تم نہیں ہو اس لیے کہ تم کالعدم قرار دیئے جا چکے ہو''

''لاحول ولا''

''ہاہاہا''

''ماموں جان...... ماموں جان'' میں مدد کے لیے پکارتا ہوں

''تمہارے ماموں جان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے''

''اگر ایسا ہے تو ان کے قریب پھٹک کر دیکھو''

وہ ہنستا ہے...... ہنستا چلا جاتا ہے پھر کہتا ہے

''بیوقوف...... میں ان کے اندر بھی موجود ہوں''

''یہ جھوٹ ہے''

''میں ہر کسی کے اندر موجود ہوں''

''بکواس بند کرو''

''میں بکواس کرتا رہوں گا اور تم سنتے رہو گے۔تم اگر سماعت سے محروم ہوجاؤ تب بھی تمہیں کیری آواز سنائی دیتی رہے گی۔''

''تم واقعی مردود ہو...... لعین ہو''

اگر اس دوران ماموں جان آجائیں تو وہ اچانک غائب ہوجاتا ہے لیکن بعض اوقات ماموں جان کی موجودگی میں بھی آدھمکتا ہے اور گفتگو کے دوران مجھے لقمے دے کر بھٹکاتا رہتا ہے۔ میرے ذہن میں عجیب وغریب سوالات اٹھاتا اور ان کے الٹے سیدھے جوابات بجھاتا ہے میں اس سے مکمل نجات چاہتا ہوں۔ ماموں جان سے کئی بار تقاضا کرچکا ہوں کہ وہ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کے پڑھنے سے میں اس سے ہمیشہ کے لیے گلو خلاصی حاصل کرسکوں مگر وہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے وظیفوں کے علاوہ قوت مدافعت پیدا کرنا ضروری ہے اور شاید میری قوت مدافعت کا امتحان لینے کے لیے ہی انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو اپنے پاس بلالیا ہے ان کی بڑی بیٹی قوت مدافعت کا بہترین امتحان ہے ماموں اور ممانی کی خواہش ہے کہ میں ں سے عقد کرلوں لیکن مجھے عورت کے وجود سے نفرت ہے وہ شیطان کے بہکاوے میں آسانی سے آجاتی ہے اس نے ہمیں جنت سے محروم کیا اس نے میرے باپ کو زہر دیا اور حلالہ کرنے کے بہانے مولوی عبدالصمد سے نکاح کر کے انہی کے پاس رہنے لگی اسی کے گناہوں کی پاداش میں وہ...... مجھ سے چمٹا رہتا ہے۔

ایک روز میں نے ماموں جان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا

''عرب کے قدیم لوگ ٹھیک ہی کرتے تھے لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ زمین میں دفن کردیتے تھے''''کیا بکتے ہو''انہوں نے ڈانٹ کر کہا''یہ درست ہے کہ عورت نے نیک بندوں کو جنم دینا کم کردیا ہے اور معاشرہ برے اور بدکار لوگوں سے بھر گیا ہے لیکن بدقسمتی سے اکیلا مرد خواہ وہ کتنا ہی صالح کیوں نہ ہو ایک بچہ پیدا کرنے سے قاصر ہے اگر عورت کے وجود کو ختم کردیا گیا تو زمین اللہ کے بندوں سے بالکل خالی ہوجائے گی۔''

''مگر گناہ سے تو پاک ہوجائے گی''

''لاحول ولا''وہ خفا ہو کر بولے''تمہاری سوچ شیطانی ہے''

تب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں خود نہیں بول رہا مجھ پر کوئی دوسرا اثر انداز ہو رہا ہے میں نے لاحول پڑھی اور ماموں جان سے معافی چاہی مگر عورت کے بارے میں میرے دل میں جو نفرت ہے وہ کبھی کم نہ ہوئی بلکہ بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ جب تک انسان دنیا میں ہے اس کا سامنا گناہ اور گناہ کی ترغیب دینے والی اشیاء سے ہوتا رہے گا اور وہ اس کا ارتکاب کرتا رہے گا کیوں نہ

سرے سے انسان ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

''یہی میں نے اللہ میاں سے کہا تھا'' وہ لقمہ دیتا ہے ''جس پر وہ بگڑ گئے۔''

ماموں جان سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں تو وہ خفا ہو کر کہتے ہیں

''لاحول ولاقوہ...... تم پھر بہک جاتے ہو''

''میں خود نہیں بہکتا مجھے بہکا دیا جاتا ہے'' میں اعتراف کرتا ہوں۔ ماموں جان کچھ پڑھ کر پھونکتے ہیں اور میں اس کے چنگل سے نکل جاتا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بعض موقعوں پر جب اسے موجود ہونا چاہیے وہ سرے سے کہیں غائب ہو جاتا ہے مثلاً جب ماموں اور ممانی کہیں چلے جاتے ہیں اور ان کی بڑی بیٹی میرے پاس گھر میں اکیلی رہ جاتی ہے اور مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہے یا جب کبھی وہ رات کو بھول کر مجھ سے ٹکرا جاتی ہے۔

چند روز ہوئے وہ دروازہ بند کیے بغیر میرے غسل خانے میں نہا رہی تھی مجھے معلوم نہیں تھا میں حسب معمول تولیہ لے کر غسل خانے میں داخل ہوا تو میرے اوسان خطا ہو گئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھ سے کوئی خطا نہیں ہوئی میں الٹے پاؤں باہر آ گیا اور اپنی مضبوط قوت مدافعت پر خود کو داد دیتا رہا وہ مجھے ایسی چھوٹی چھوٹی رعائتیں دیتا رہتا ہے لیکن مضبوط قوت مدافعت کے باوجود مستقل طور پر میرا پیچھا نہیں چھوڑتا' ہاں پرسوں ایک عجیب قوت مدافعت کے باوجود مستقل طور پر میرا پیچھا نہیں چھوڑتا' ہاں پرسوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔

میں گھر میں اکیلا تھا وہ سب لوگ کہیں گئے ہوئے تھے کہ وہ میرے اندر سے نکل کر اور متشکل ہو کر سامنے آ گیا۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر کی مگر خوبصورت عورت کا روپ اختیار کر رکھا تھا' میں نے پہلی نظر میں اسے کوئی بھکارن جانا اور اسے کچھ دینا چاہا مگر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی

''تم کب بالغ ہو گے؟''

''کیا تم مجھے نابالغ سمجھتی ہو'' میں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا'' اور اگر میں بالغ ہو جاؤں تو تمہیں اس سے کیا؟''

کہنے لگی

''میں تمہاری ماں ہوں''

''تم...... تم......؟'' میں غصے اور نفرت سے کھول اٹھا اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

’’ہاں...... میں تمہاری ماں ہوں۔ایک ظالم اور شیطان شخص نے میارے اور تمہارے باپ کے درمیان غلط فہمی اور نفرت کا بیج بویا‘ پھر سازش کے تحت تیسرے شخص کے عقد میں دے دیا اور تمہارے باپ کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالا۔اب مجھے تمہاری زندگی خطرے میں نظر آتی ہے۔تم خود کو اور اسے پہچانو۔‘‘

خدا کا شکر ہے کہ میری پرورش ماموں جیسے نیک آدمی کے ہاتھوں ہوئی ہے ورنہ وہ مجھے میری ماں کے روپ میں ورغلانے میں کامیاب ہو جاتا۔میں نے اس پر لاحول پڑھی اور دھکے دے کر گھر سے نکال دیا اور آج تیسرا روز ہے کہ وہ پلٹ کر نہیں آیا لیکن جاتے جاتے کم بخت میرے ذہن میں شک کے تھوہر کا کانٹا سا بو گیا ہے۔



خلا اندر خلا

اس کے سامنے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر بڑی بڑی باتیں لکھی پڑی ہیں۔ جونہی شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھا ہوا شخص اشارہ کرتا ہے وہ بولنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر آج اسے اپنی آواز بدلی بدلی معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہ بھی اس کا وہم ہو۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی آواز تبدیل ہو جاتی ہے۔ جیسے اس کے اندر کوئی اور بول رہا ہو۔ وہ چپ ہو جانا چاہتا ہے مگر سامنے بیٹھا ہوا شخص اسے بات جاری رکھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ بولتے بولتے اسے لگتا ہے کہ جیسے اس کی آواز مدھم ہونے لگی ہے اور آہستہ آہستہ سرگوشی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ وہ معذرت کر کے گلا صاف کرتا اور اپنے اندر سے آواز کا سوت کھینچ نکالنے کے لئے زور لگاتا ہے مگر شاید اس کے اندر آواز کے سوت کا سارا لچھا ختم ہو گیا ہے۔ اس کی آواز مسلسل ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ پھر اچانک اسے لگتا ہے کہ جیسے وہ چپ ہو گیا ہو۔ حالانکہ اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی اور نہ کر سکتا ہے۔ اگر کر سکتا تھا تو وہ گھر سے سیدھا یہاں نہ آتا۔ کسی اور طرف کو نکل جاتا۔ کسی بل میں دبک جاتا۔ اس کے ہونٹ اس سلائی مشین کی طرح جو بغیر دھاگے کے چل رہی ہو اب تک ہل رہے ہیں۔ وہ پریشان ہو کر شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھے ہوئے شخص کو معذرت طلب نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس شخص کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی ہوں گی۔ وہ سٹپٹا کر کھڑا ہو جائے گا اور ابھی ابھی چند لمحوں میں ہر طرف اودھم مچ جائے گا۔ مگر یہ دیکھ کر اسے بے حد مسرت ہوتی ہے کہ سامنے والا شخص نہایت پر سکون اور مطمئن ہے۔ بالکل اس کی بیوی کی طرح جو صبح ہی صبح اسے شرمندہ کر کے باورچی خانے میں جا کر روٹیاں پکانے لگی تھی۔ پتہ نہیں آج کیسی صبح طلوع ہوئی تھی کہ ہر چیز کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ رنگ بدلا ہوا نہ ہوتا تو صبح ہی صبح اسے خفت نہ اٹھانا پڑتی۔ اس نے منڈیر پر بیٹھے ہوئے کبوتر کو دیکھ کر یوں ہی کہہ دیا تھا۔

”واہ کیا صحت مند کبوتر ہے۔“

وہ ایسے ہنسی جیسے اس سے انتقام لے رہی ہو۔

”اچھا تو اب آپ کو کوے بھی کبوتر نظر آنے لگے ہیں۔“

”کوا۔۔۔۔۔۔ ارے بھئی وہ تو کالا ہوتا ہے۔“

”یہ کوا ہی ہے۔“ اس نے زہر خند سے جواب دیا۔

''اور کالا بھی ہے۔آپ اب عینک لگوا لیجئے۔''

اس نے کوے کو جو اسے سفید کبوتر نظر آتا تھا بار بار غور سے دیکھا۔اس کی شکل وصورت واقعی کوے جیسی تھی۔مگر اس کا رنگ اسے بالکل سفید نظر آتا تھا۔کچھ دیر بیوی اسے الجھ کر اس نے سوچا آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوا سفید ہے یا سیاہ۔کا یہی غنیمت نہیں ہے کہ وہ اور اس کی بیوی کم از کم اس بات پر تو متفق ہیں کہ وہ کوا ہے اور سامنے منڈیر پر موجود ہے۔وہ غسل خانے کی طرف جارہا تھا کہ بلیوں کے لڑنے اور غرانے کی خوفناک آوازیں سنائی دیں۔اس نے بڑی لڑکی سے پوچھا۔

''یہ بلیاں کہاں لڑ رہی ہیں؟''

لڑکی کی بجائے پھر اس کی بیوی نے جواب دیا۔''ثمینہ بیٹی بند کر دے حد ہوگئی۔''

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔مگر بلیوں کے لڑنے اور غرانے کی آوازیں بند ہوگئیں۔وہ غسل خانے میں آکر شیو بنانے لگا۔شیو بناتے بناتے اس نے آئینے میں اپنے بالوں کو دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ایک ہی رات میں اس کے سر کے بال سفید ہوگئے تھے مگر کیسے؟ کیا رات اتنی طویل تھی یا عجیب طرح کی صبح طلوع ہوئی تھی۔جس میں چیزوں کے رنگ اور ذائقے بدل گئے تھے۔اس نے چاہا بیوی کو آواز دے مگر اسے کوے والی تکرار یاد آگئی۔پھر اسے یاد آیا کہ ایک بار وہ اسے ایک خوبصورت باغ میں لے گیا تھا اور جب اس نے پھولوں اور مخملی سبزے کی طرف اشارہ کر کے اس کی تعریف کی تھی تو وہ پریشان ہو کر کہنے لگی تھی۔

''اس لق و دق صحرا اور ویرانے کو تم باغ کہتے ہو یہ خاردار جھاڑیوں اور جگہ جگہ بلوں سے جھانکتے ہوئے سانڈے۔۔۔۔۔۔

اونہہ''

پھر ایک دفعہ وہ اس کے ہمراہ راستہ بھول کر ویرانے میں پھنس گیا تو اس کی تشفی کے لئے اس نے کہا۔''ہم جلد ہی یہ صحرا عبور کر لیں گے۔''تو وہ تنک کر بولی''تم اس سبزہ زار کو صحرا کہتے ہو؟''

بیوی سے ایسی ہی باتوں کی وجہ سے اس کی تکرار ہوتی رہتی تھی مگر وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے اور ایک دوسرے کے لئے قربانیاں دیتے آئے تھے۔اس نے سوچا رنگوں کے چکر میں پڑ کر گھر کی فضا کو مکدر نہیں کرنا چاہیے۔

ناشتہ کر کے وہ جلدی جلدی گھر سے باہر آیا۔گھر سے باہر ساری چیزیں اجنبی اور غیر مانوس لگ رہی تھیں۔اسے سارے رنگ پھیکے دکھائی دے رہے تھے۔سفیدی ہر چیز پر غالب تھی۔اسے خیال آیا مسلسل اور شدید بارش کی وجہ سے چیزوں کے رنگ اڑ گئے ہوں گے۔

گلی میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا تھا۔کئی روز سے قیامت خیز بارش ہوتی رہی تھی اور آج کئی دنوں کے بعد مطلع ذرا صاف تھا۔اس نے دیکھا گھر کے باہر ہر طرف کوڑا کرکٹ جمع تھا اور نالیاں غلاظت اور کیچڑ سے بھری ہوئی تھیں۔گٹروں سے گندا اور بدبودار پانی ابل رہا تھا۔اس نے بدبو سے بچنے کے لئے ناک پر رومال رکھ لیا اور پتلون کے پائنچے اوپر کر کے گلی کی دلدل عبور کرنے لگا۔آہستہ آہستہ اس کا ذہن صاف ہونے لگا۔اسے بھولی ہوئی باتیں اور چیزیں یاد آنے لگیں۔اسے یاد آیا کہ کس طرح بستی کے لوگ بارش کی دعائیں مانگتے تھے۔وہ سخت سردی اور لو سے پریشان تھے۔اس بار نہایت سخت گرمی پڑی تھی۔لگتا تھا سورج سوا نیزے پر آ گیا ہے۔دن بھر آگ برستی۔دھوپ کے شعلے سڑکوں' گلیوں' بازاروں' کھیتوں اور گھروں کی چھتوں پر ناچتے۔رات دیر تک گرم ہوا چلتی رہتی۔پہاڑوں اور جنگلوں میں چشموں کے ابلنے اور ہریالی کے لہرانے کی بجائے آگ دہکتی۔ائیر کنڈیشنڈ کمروں اور سوئمنگ پولوں کے علاوہ ساری زندگی جھلس کر رہ گئی تھی اور لوگ گرمی' لو اور خشک سالی کے خوف سے گھبرا کر بانگیں دینے لگے تھے۔

اسے یاد آیا کہ ایک شکر دوپہر کو سیاہ بادل گھر آئے اور قبل از وقت شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا اور اس قدر بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گیا۔گلیاں اور سڑکیں ندی نالے بن گئیں۔ندی نالے چنگھاڑنے اور دریا بپھرنے لگے۔بستیوں اور ویرانوں پر بجلی کڑکتی' چمکتی اور کوندتی رہی۔کچے مکان ڈھے گئے۔پکے مکان ٹپکنے لگے۔مویشی اور انسان پانی کے تند ریلوں میں بہہ گئے۔کھیت اور فصلیں برباد ہو گئیں۔زمین کے اندر بلوں اور سوراخوں میں چھپی ہوئی آفات باہر نکل آئیں اور زمین کے سینے پر رینگنے لگیں۔بہت سی جگہوں پر بند ٹوٹ گئے۔بستیاں مٹ گئیں۔لوگ بے گھر ہو گئے۔طرح طرح کی وبائیں پھوٹ نکلیں اور بہت سا اناج پانی میں بہہ گیا۔پھر جیسے صدیوں بعد مطلع صاف ہوا اور صبح طلوع ہوئی مگر یہ کیسی عجیب صبح تھی کہ چیزوں کے رنگ بدل گئے تھے یا کم از کم اسے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

اسے یاد آیا۔آتی بار بس سٹاپ پر نا آشنا چہروں کے ہجوم نے اسے آج بھی حسب معمول عقیدت اور محبت کی نظروں سے دیکھا تھا۔وہ ان نظروں اور چہروں پر لکھے ہوئے خوشگوار جذبات سے آشنا تھا۔مگر آج وہ ان نظروں سے چھپ جانا چاہتا تھا۔اسے لگ رہا تھا جیسے وہ' وہ نہ ہو۔اس نے اپنا روپ دھار رکھا ہو۔

اس نے چاہا جانے کا ارادہ ترک کر دے۔کسی اور طرف کو نکل جائے۔مگر پھر اسے بیوی بچے اور گھر یاد آیا اور چیزوں کی وہ فہرست بھی جو باغ کو ویرانہ' صحرا کو سبزہ زار اور کبوتر کو کوا سمجھنے والی بیوی نے اس کی جیب میں اڑس دی تھی۔

بس روانہ ہوئی تو بہت سے لوگوں نے اس کے ٹکٹ کے پیسے ادا کرنا چاہے مگر اس نے منع کر دیا۔بس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں

تھی۔ مگر اس کے لئے سیٹ خالی کر دی گئی۔ یہ کوئی انوکھی اور خلاف معمول بات نہیں تھی مگر آج اسے لوگوں کی محبت اور عقیدت سے خوف لگ رہا تھا اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے نہ پہچانیں۔ اسے عام آدمیوں کی بھیڑ میں گم ہو جانے دیں وہ جہاں جانا چاہے جائے۔ جہاں بیٹھنا چاہے بیٹھے۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہ دے اس کا نوٹس نہ لے۔ کاش اس کے پاس سلیمانی ٹوپی ہوتی تو وہ سب کی نظروں سے بچ کر نکل جاتا۔ مگر سلیمانی ٹوپی ہوتی تو وہ وہاں کیوں جاتا۔ وہ قہقہے لگاتا ہوا ان کے پاس سے گزر جاتا جو اس کے منتظر تھے۔

سڑک کے دونوں جانب چھوٹی بڑی دکانیں تھیں۔ بازار کے عقب میں پھر بازار تھے۔ بازاروں اور منڈیوں میں خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ اچھی بری ہر قسم کی چیزیں بیچی اور خریدی جا رہی تھیں۔ ہر شخص اپنا مال بیچنے کی فکر میں تھا۔ اس نے اپنی ڈھارس بندھائی زندہ رہنے کے لئے ہر کسی کو کچھ نہ کچھ بیچنا ہی پڑتا ہے۔ جو چیزیں اپنے پاس نہ ہوں انہیں حاصل کرنے کے لئے جو کچھ میسر ہو بیچنا ضروری ہوتا ہے لیکن اس کی ڈھارس نہ بندھ سکی۔ رہ رہ کر اس کا جی چاہتا وہ کہیں چھپ جائے۔ کسی اور طرف کو نکل جائے مگر وہ اس طرف کو جدھر اس کا جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مسلسل کھنچا چلا جا رہا تھا۔ جیسے دوسرے سرے پر کوئی اس کی میلوں لمبی انتڑی کا سرا پکڑے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا' انتڑی کی تکلیف میں کمی ہوتی جاتی۔

بس سے اتر کر وہ پیدل چلنے لگا۔ اب فاصلہ اور کم ہو گیا تھا۔ وہ یہ فاصلہ ایک ہی جست میں طے کر لیتا تھا مگر آج جب اس نے فاصلہ کو ایک ہی سانس میں طے کرنے کے لئے خود کو ایڑ لگائی تو اس کے اندر کوئی چیز اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑی ہو گئی اور زور زور سے ہنہنانے لگی اور ابھی وہ اسے چمکارنے اور تھپتھپاتے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ سفید رنگ کے کوے اور گدھ اس کے سر پر منڈلانے لگے۔ اور اسے پناہ لینے کے لئے اس عمارت میں داخل ہونا پڑا جس میں وہ داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

مگر یہاں آ کر وہ ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ بولتے بولتے اسے اپنی آواز بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر ہلکی ہوتی گئی اور آخر کار بالکل ختم ہو گئی اور اب وہ شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھے ہوئے شخص کے اشارے پر محض ہونٹ ہلا رہا تھا۔ مگر وہ حیران ہے کہ جب اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تو سامنے بیٹھا ہوا شخص اس قدر خاموش اور پرسکون کیسے ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب تک وہ دروازہ کھول کر اندر کیوں نہیں آ گئے ہیں اور ہر طرف شور کیوں نہیں مچ گیا ہے۔

اچانک اسے خیال آتا ہے کہ کیا پتہ اس کی آواز اس کے اپنے سوا سب کو سنائی دے رہی ہو لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟ جہاں تک اسے معلوم ہے جب تک آواز اور کانوں کے درمیان ہوا کا واسطہ موجود رہتا ہے آواز کی لہریں کانوں تک پہنچتی رہتی ہیں تو کیا اس کی آواز اور کانوں کے درمیان خلا پیدا ہو گیا ہے؟ ------ کیا وہ اپنی آواز کی لہریں سننے سے محروم ہو گیا ہے؟ ------ کیا وہ اب بھی

آوازیں اور آہٹیں نہیں سن سکے گا؟۔۔۔۔۔سوالات چلتی ہوئی مشینوں کی طرح اس کے اندر گھر ر گھر کرنے لگتے ہیں اور ابھی وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اسے یاد آتا ہے کہ انسانی کان وہی آواز سن سکتے ہیں جس کی فریکوئینسی بیس سے بیس ہزار تک ہو تو کیا اس کی آواز کی موجوں کا تعدد بیس سے بھی کم ہے یا اس کی آواز UltraSonic ہے؟ کیا چگادڑ کی طرح اس منہ سے بھی اس قدر تیز چیخ کی آواز نکل رہی ہے جسے انسان کان سننے سے قاصر ہیں مگر کاش ایسا ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو سامنے بیٹھا ہوا شخص اس قدر پر سکون دکھائی نہ دیتا۔ یقیناً اس کی آواز میں نہیں سماعت میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔

وہ اسی شش و پنج میں ہے کہ اس کے سامنے رکھے ہوئے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر لکھی ساری عبارت ختم ہو جاتی ہے اور شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھا ہوا شخص اسے باہر آنے کا اشارہ کرتا ہے۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آتا ہے۔

سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔

لوگوں کے ہنسنے بولنے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے اور پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں اسے صاف سنائی دیتی ہیں۔



شب چراغ

خوشبو اور بدبو کے معاملے میں وہ بہت حساس تھا اور جس طرح شاعر غنچے کی چٹک سن سکتا۔ مصور آواز کا رنگ دیکھ سکتا اور مغنی سر سے ہمکلام ہوسکتا ہے بالکل ایسے ہی وہ خوشبو کو پڑھ سکتا تھا اور محسوس کرسکتا تھا۔

خوشبو خواہ کیسی ہی مدھم اور کتنے ہی فاصلے پر ہوتی وہ ہوا کے کسی نہ کسی جھونکے سے اسے اچک لیتا ہے۔

اسے بہت سی اور طرح طرح کی خوشبوؤں کی پہچان کا دعوی تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اسے مٹی اور پتھر سے بھی خوشبو آتی تھی اور وہ چیزوں کو دیکھ اور سن کر بھی ان کی خوشبو محسوس کرسکتا تھا۔ اس کے دوست مذاق میں اسے نجس چوپائے سے تشبیہ دیتے مگر وہ اس کا برا نہ مناتا کہتا۔

''تمہاری زکام زدہ ناکیں ان گنت خوشبوؤں سے محروم ہیں جو میں سونگھتا رہتا ہوں یا سونگھ سکتا ہوں۔''

مگر اب یہی خوبی جس پر وہ کبھی اترایا کرتا تھا اس کے لیے وبال جان بن گئی تھی۔ پتہ نہیں وقت کے ساتھ ساتھ اس کے سونگھنے کی حس میں نقص پیدا ہوگیا تھا یا خوشبوؤں اور بدبوں کی نوعیت تبدیل ہوگئی تھی۔ اسے کچھ عرصہ سے اپنے قریب کہیں بدبو کا احساس ہوتا۔ وقفوں کے ساتھ بساندسی آتی۔ اس نے اس بدبو کا سراغ لگانے اور اس کی نوعیت جاننے کی بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی اور جیسے ہنستے کھیلتے' گپ لگاتے درمیان میں کبھی کبھی اداس کردینے والا کوئی خیال آجاتا ہے یا جیسے ناول پڑھتے یا فلم دیکھتے ہوئے کبھی کبھی کوئی تلخ یاد آجاتیا ہے بالکل اسی طرح دفتر میں کام کرتے' ڈکٹیشن دیتے' ٹیلیفون سنتے اور ملاقاتیوں سے رسمی گفتگو کرتے کرتے درمیان میں اچانک لحہ بھر کے لیے ایک ناگواری بدبو کا احساس ہوتا۔ یوں لگتا جیسے کہیں اس پاس کوئی چیز مرگئی ہے اور گل سڑ رہی ہے۔

اس کے کہنے پر دفتر میں ہر روز صفائی کی جانے اور دوائی چھڑکی جانے لگی مگر بدبو کے احساس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ تنگ آکر ایک دن اس نے اپنے عملے کی مدد سے الماریوں' شیلفوں اور میز کی درازوں میں رکھے کاغذات اور فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا مگر کوئی زندہ یا مردہ چیز کہیں سے برآمد نہ ہوئی پھر بھی اسے یقین تھا کہ کہیں قریب ہی کوئی چیز گل سڑ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسی بدبو تھی اور اس سے کیسے نجات پائی جاسکتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے دفتر کے عملے کو کسی قسم کی بدبو کہیں سے نہ آتی

تھی اوران کے خیال تھا کہ یہ اس کا وہم ہے۔

اسے یقین ہو چلا تھا کہ یا تو وہ خوشبو اور بدبو میں تمیز کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا یا پھر کوئی چیز اس کے اپنے اندر مرگئی تھی۔ بچپن میں ایک بار اس کا زکام بگڑ گیا تھا اور کئی روز تک اسے ہر چیز سے بدبو آتی رہی تھی کیا پتہ اس بار لگنے سے پہلے ہی اس کا زکام بگڑ گیا ہو مگر پھر اسے خیال آتا کہ اگر ایسا ہوتا تو اسے ہر وقت ہر چیز سے بدبو آتی۔

ایک روز اس نے سوچا کہ کسی تجربہ کار ڈاکٹر یا ماہر نفسیات سے رجوع کرے کیا پتہ سچ مچ اس کے سونگھنے کے اعضاء میں کوئی خلل واقع ہو گیا ہو۔ لیکن جس روز اس نے اپنا معائنہ کرانے کا سوچا اسی روز کیئر ٹیکر نے اطلاع دی۔

''سر آپ ٹھیک کہتے تھے۔ فالس سیلنگ سے مری ہوئی چوہیا برآمد ہوئی ہے...... ہم اس کے لیے معافی چاہتے ہیں۔''

مری ہوئی چوہیا کے بارے میں سن کر وہ بہت خوش ہوا اور اس کا یہ شک کہ اس کی قوت شامہ میں کوئی نقص واقع ہو گیا تھا یا اس کے اندر کوئی چیز مرگئی تھی' دور ہو گیا اور وہ اطمینان سے DFA پڑھنے میں مصروف ہو گیا مگر جب چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے وہ اوپر سے آئی ہوئی ایک فائل کو نیچے بھیجنے کے لیے دستخط کر رہا تھا تو وہی بساندسی پھر آئی اور لمحہ بھر کے لیے اسے پریشان اور بدمزہ کر کے غائب ہو گئی۔ اس نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلایا اور کہا۔

کیئر ٹیکر صاحب سے کہو سیلنگ پینلز اکھاڑ کر دوبارہ چیک کریں یقیناً ایک آدھ اور چوہیا برآمد ہو گی۔

انہوں نے ایسا ہی کیا مگر کوشش کے باوجود کوئی زندہ یا مردہ چوہیا کہیں سے برآمد نہ ہو سکی پھر بھی اسے یقین تھا کہ انہوں نے سہل پسندی سے کام لیا ہو گا ورنہ کچھ نہ کچھ مرا ہوا کہیں نہ کہیں ضرور موجود تھا اور گل سڑ رہا تھا۔

دوپہر کو اسے باس نے اپنے کمرے میں بلایا وہ حاضر ہوا تو انہوں نے خلاف معمول نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا اس کی خیریت دریافت کی اور اس کے لیے کافی منگوائی۔ کمرے میں میز پر سجے پھولوں کی بھینی بھینی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن جب وہ کافی پیتے ہوئے ہدایات لے رہا تھا تو اچانک سڑاند کا ایک جھونکا آیا اور اسے پریشان کر گیا اس نے ادھر ادھر ہوا میں سونگھا اور باس سے پوچھا۔

''سر آپ کو بھی بدبو محسوس ہوئی؟''

''کیسی بدبو؟''

''جیسے کوئی چیز مری ہوئی ہو۔ چوہیا' چھپکلی یا سم تھنگ لائک دیٹ؟''

انہوں نے ریوانگ چیئر پر گھوم کر اپنے اردگرد کی ہوا سونگھی اور بولے۔

''آئی ڈونٹ فائینڈ اینی تھنگ رانگ''

پھر کچھ سوچ کر خود ہی کہنے لگے

''یس یو آر رائٹ...... میری پنڈلی پر پھوڑا نکلا ہوا ہے شب چراغ''

''شب چراغ؟''

''ہاں شب چراغ یعنی کاربنکل ڈاکٹر سے مایوس ہو کر اب میں ایک حکیم صاحب سے علاج کرا رہا ہوں۔ انہوں نے مرہم دیا ہے اسی کی بو ہوگی۔'' ''یہ کوئی خطرناک تو نہیں؟''

''ہے تو سہی۔ نام تو اس کا سرخ یاقوت کی مماثلت سے بڑا خوبصورت ہے مگر بڑی تکلیف دہ چیز ہے۔''

میں معافی چاہتا ہوں سر۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا وہ دوسری قسم کی کوئی بو تھی۔''

''کوئی بات نہیں''

''وہ ہدایات لے کر چلا گیا لیکن اسے شک تھا کہ ضرور اسی پھوڑے کی بساندان کے دفتر میں پھیلی ہوئی تھی یا پھر باس کے کمرے میں بھی کہیں کوئی چوہیا مری پڑی تھی۔ لیکن اگلے روز اسے وہی سرانڈ کانفرنس روم سے بھی آئی...... اور اس نے کیئرٹیکر کو سیلنگ اکھاڑنے کی ہدایت کی۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ اسے دفتر کے ہر کمرے سے وہی بساند آنے لگی۔ مرے ہوئے گلے سڑے چوہے کی۔ اسے بڑے بڑے خیال آتے۔ کہیں شہر میں طاعون پھوٹنے والا نہ ہو۔ کہیں اس کے اردگرد لوگوں میں ہر ایک کو کاربنکل نہ نکل آیا ہو۔ اور اس کا جی ہر وقت متلانے لگا اور اسے ابکائیاں سی آتی رہتیں کئی بار وہ اٹھ کر قے کرنے کے لیے باتھ روم بھی گیا مگر ہر بار اسے صرف ابکائیاں آتی رہیں اور تھوک سے منہ لتھڑ لتھڑ جاتا۔

آخر اس نے دفتر سے چند روز کی چھٹی لے لی۔ شاید کچھ روز آرام کرنے اور لوگوں سے الگ رہنے سے اس کا وہم دور ہو جائے اور بدبو کا احساس کم ہو جائے لیکن اگلی صبح جب وہ دیر سے سو کر اٹھا اور اخبار پڑھنے لگا تو اسے کہیں قریب ہی سے وہی بدبو پھر آئی جیسے چربیلا گوشت جل رہا ہو یا جیسے شب چراغ!

اس نے بیوی کو آواز دی وہ آئی تو اس نے پوچھا

''یہ بدبو کیسی ہے؟''

''کونسی بدبو؟''

''تمہیں محسوس نہیں ہوتی ؟''

''نہیں مجھے زکام ہے۔''

''یوں لگتا ہے جیسے کوئی چیز سڑ رہی ہو دفتر میں بھی ایسا ہی تھا۔''

''میں سمجھ گئی'' وہ بولی ''وہ میں آملیٹ بنا رہی تھی ذرا جل گیا ہے''

''شاید اسی کی ہو'' اس نے بے یقینی سے کہا ''ذرا احتیاط کرو میں پہلے ہی اس سڑاند کے احساس سے عاجز آ چکا ہوں۔''

اخبار سامنے رکھ کر وہ ناشتہ کرنے لگا تو اسے کہیں سے پھر وہی بدبو آئی۔ اس نے کہا

''اب تو تم آملیٹ نہیں بنا رہی ہو۔ اب یہ کیسی بدبو ہے''

اس کی بیوی نے ہوا میں دو ایک بار سونگھا پھر بولی

''مجھے تو زکام ہے

''کہیں گٹر کا ڈھکنا تو کھلا نہیں رہ گیا؟''

''ڈھکنا کھلا ہوتا'' وہ ہنس کر بولی ''تو آپ یہاں بیٹھ کر ناشتہ کر سکتے تھے؟ ہاں ہمارا فلش کل سے ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ ٹھہریں میں فینائل چھڑک کر آتی ہوں۔''

وہ چلی گئی تو اس نے ریڈیو کا سوئچ آن کیا اور خبریں سننے لگا اور حالانکہ اس کی بیوی اب تک فینائل چھڑک چکی تھی مگر اسے بدبو کے بہت سے جھٹکوں نے آن گھیرا۔ اس نے تقریباً چلا کر کہا ''اب میں گھر سے بھاگ کر کہاں جاؤں؟''

''آپ اس معاملے میں بہت حساس ہیں کمروں کی سیلن وغیرہ ہے اور کچھ نہیں۔ آپ لان میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟''

''ہاں یہ ٹھیک ہے'' اس نے جواب دیا اور اخبار لے کر لان میں آ گیا۔

جب وہ کرسی پر نیم دراز ہو کر اخبار پڑھ رہا تھا تو اسے پھر وہی سڑاند آئی اس نے اخبار کو سونگھ کر دیکھا اور اسے ہنسی آ گئی وہ کہنے لگا۔

''اخبار سے بھی بدبو آ رہی ہے اخباری کاغذ اور سیاہی کی'' اس کی بیوی نے اس کی بات نہیں سنی تھی باہر آتے ہوئے بولی ''آپ کے سونگھنے کی حس واقعی بہت تیز ہے آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں بڑی پیٹی کے نیچے کم بخت چھپکلی مری پڑی تھی۔''

اس کی بیوی نے اس کے کہنے پر گھر کا کونہ کونہ صاف کیا۔ کپڑوں، لحافوں اور قالینوں کو دھوپ میں ڈال کر سکھایا کرسیوں اور

صوفوں کو کھٹملوں اور لال بیگوں سے پاک کیا غسل خانوں اور نالیوں میں دوائی چھڑکی۔ ٹرنکوں میں نئے سرے سے فینائل کی گولیاں رکھیں اور پائپ سے سارے گھر کے فرشوں کو دھوڈالا۔ مگر سہ پہر کے وقت جب وہ ٹیلی ویژن پر وگرام دیکھ رہا تھا بدبو کا جھونکا پھر آیا اور اس کا جی متلا کر چلا گیا اس کی بیوی نے کہا

''میرا خیال ہے پچھلی گلی والے آج پھر سری پائے اٹھالائے ہیں اور اب انہیں ساڑ رہے ہیں؟''

''ہوسکتا ہے'' اس نے کہا ''بال اور چمڑا جلنے کی ملی جلی بو ہے' چمار کہیں کے۔''

اگلے روز جب وہ سودا سلف خریدنے بازار گیا تو اسے یہ جان کی تعجب ہوا کہ سگریٹ کے کھوکھے کریانے اور جوتوں کی دکانوں حتیٰ کہ بک سٹال سے بھی وہی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ پتہ نہیں لوگوں کو پھوڑے نکل آئے تھے یا انہوں نے صفائی کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا یا پھر وہ کوڈز ودحسی کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کرے' کہاں جائے پیچھا کرنے والے بدبو کے جھونکوں سے کیسے بجات حاصل کرے۔

اچانک اسے خیال آیا کیوں نہ وہ اس تقریب میں چلا جائے جس کے بارے میں اس نے صبح اخبار میں خبر پڑھی تھی۔ کیا پتہ اس کا جی وہاں جا کر بہل جائے۔ اس نے جلدی جلدی خریداری مکمل کی' گھر آکر کپڑے تبدیل کیے اور ناک پر رومال رکھے بدبو کے جھونکوں سے بچتا بچاتا تیز تیز قدم اٹھاتا اجلاس میں پہنچا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔

ہال میں سگریٹ کے خوشبودار دھوئیں' لونڈر اور خوبصورت شعروں اور لفظوں کی ملی جلی باس پھیلی ہوئی تھی اس نے اطمینان کا سانس لیا اور تقریر سننے لگا مگر اس کی خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ تقریر سنتے سنتے اس کا جی متلانے لگا اور اسے ابکائیاں آنے لگیں۔

خوشبو اور بدبو کے معاملے میں وہ بہت حساس تھا اور جس طرح شاعر غنچے کی چٹک سن سکتا' مصور آواز کا رنگ دیکھ سکتا اور مغنی سر سے ہم کلام ہوسکتا ہے بالکل ایسے ہی وہ خوشبو کو پڑھ سکتا تھا اور محسوس کرسکتا تھا۔



بیک مرر (BACK MIRROR)

یہ جس بدقسمت مسافر بس کی کہانی ہے وہ آخر میں حادثے کا شکار ہو جاتی ہے بہت آدمی ہلاک ہو جاتے ہیں باقی زخمی ہو کر پہلے سڑک کے کنارے اور پھر ہسپتالوں میں تڑپتے اور کراہتے رہتے ہیں حادثے کے وقت راہگیر ان کا سامان لوٹ لیں گے ان کی جیبیں خالی کریں گے اور ان کی زندہ اور مردہ کلائیوں سے گھڑیاں اور چوڑیاں اتاریں گے۔ڈرائیور چھلانگ لگا کر فرار ہونے کی کوشش کرے گا مگر دائیں جانب والے اگلے پہیئے کے نیچے آ کر اس کا سر کچلا جائے گا۔زندہ بچ رہنے اور زخمی ہونے والے مسافر جھوٹے بیانات ریکارڈ کرائیں گے کہ انہوں نے ڈرائیور کو بس تیز چلانے 'بیک مرر میں بار بار عورتوں کو جھانکنے اور کنڈکٹر کو اوورلوڈنگ سے منع کیا تھا۔لیکن یہ سب باتیں بعد کی ہیں اس وقت بس شہر کے بڑے اڈے میں کھڑی ہے اور کنڈکٹر سواریوں کو ادھر ادھر اٹھاتا بٹھاتا اور نئے آنے والوں کے لیے زبردستی جگہ بناتا ہے بہت سے لوگ تھوڑی دور جا کر سیٹ مل جانے کی امید میں کھڑے ہیں بے چارے نہیں جانتے کہ انہیں کس صورتحال سے دوچار ہونا ہے۔

نارد ڈرائیور کی سیٹ کے نیچے چھپا بیٹھا ہے جونہی ڈرائیور سیلف لگا کر بس اسٹارٹ کرتا ہے وہ سیٹ کے نیچے سے نکل کر اس کے برابر بیٹھ جاتا ہے اور زندہ جسموں کے تازہ لہو کی خوشبو سونگھتا اور پاس کھانے اور ہڈیاں چپانے کا خیال کر کے ہنستا ہے۔

ڈرائیور کو ڈرائیونگ برائے نام سی آتی ہے۔وہ پہلے اسی بس کا کنڈکٹر تھا لیکن اس نے اوپر والوں کے کان بھر بھر کر اصلی ڈرائیور کو ملازمت سے نکلوا دیا ہے۔جب مالکوں نے اس کی باتوں پر یقین کر کے پرانے اور تجربہ کار ڈرائیور کو چھٹی دے دی تو اس نے سفارش سے بنوایا ہوا لائسنس جیب سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور حلف اٹھایا کہ وہ ہمیشہ ان کا وفادار رہے گا اور انہیں زیادہ پیسے کما کر دے گا انہوں نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا اور چابیاں اسے تھما دیں اور آج وہ پہلی مرتبہ لمبے روٹ پر بس لے کر چلا ہے۔بس کو سواریوں کو منزل پر پہنچانا اس کا فرض ہے مگر وہ اپنے اناڑی پن 'غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے بس کو حادثے سے دوچار کر دے گا۔

بس ابھی اڈے سے روانہ نہیں ہوئی...... وہ اپنی نئی سیٹ پر بیٹھ کر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ ہارن بجاتا ہے' ہارن

بجاتے ہوئے اس کی انگلیاں انجانی لذت سے لتھڑی جاتی ہیں اسے ہارن بجاتے ہوئے بہت مزہ آتا ہے وہ اس دن کے خواب ہمیشہ سے دیکھتا رہا ہے......

بس کا نیا کنڈکٹر مسلسل سواریاں بٹھاتا جا رہا ہے...... ہاکر بس کے آگے پیچھے موت کے فرشتے بن کر آوازیں دیتے ہیں اور مسافروں کو بس کی طرف گھسیٹے ہیں۔ مسافران اگلی سیٹوں کی طرف خوشی خوشی لپکتے ہیں جو حادثے کے وقت ان کی ہڈیوں سمیت چور ہو جائیں گی۔ بائیں جانب دھوپ ہے۔ اس سے بچنے کی خاطر ہر شخص ایمن جانب کی کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے۔ بے چارے نہیں جانتے کہ حادثے کے وقت بس کا یہی حصہ نیچے کی جانب ہوگا اور کھڑکیوں کے شیشے ان کے جسموں میں پیوست ہو جائیں گے۔

ایک آدمی کا دوسرے سے سیٹ پر پاؤں رکھنے اور اس کے کپڑے خراب کرنے پر جھگڑا ہو رہا ہے بے چارے کو اندازہ نہیں کہ اس کے کپڑے تھوڑی دیر بعد خون اور نمی سے لتھڑ جائیں گے۔

ایک اور شخص اپنا ہینڈ بیگ سیٹ پر رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کی ریکسین خراب نہ ہو اسے کیا علم کہ ہینڈ بیگ کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

دو جوان عورتیں اپنے گورے چٹے چہروں پر سے نقاب اٹھائے اندر آتی ہیں۔ نارو ڈرائیور کی بغل میں چٹکی لیتا ہے۔

وہ ہارن بجانے کی لذت سے لتھڑی ہوئی انگلیوں سے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دبا دیتا ہے۔ "سانوں وی لے چل نال وے باؤ سوہنی گڈی والیا۔"

ایک اور جوڑا اندر آتا ہے مرد نے دو اڑھائی برس کا ٹماٹر جیسے گالوں والا بچہ اٹھایا ہوا ہے۔ بس میں داخل ہوتے ہی بچہ کلکاری مارتا اور توتلی باتوں کے پھول بکھیرتا ہے۔ سواریاں یہ پھول اٹھا اٹھا کر سونگھتی ہیں بالوں اور لباسوں میں اڑس لیتی ہیں۔ سبھی پلٹ پلٹ کر بچے کو پیار سے دیکھتے ہیں۔ نارو بچے کو دیکھتا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے۔ بچے کی ماں سیٹ پر بیٹھ کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیتی اور اس کا وہ سر چومتی ہے جسے ایکسیڈنٹ کے وقت اچھل کر چھت سے ٹکرانا اور پاش پاش ہونا ہے۔

بس اڈے سے نکلتی ہے۔

نارو قہقہہ لگاتا ہے۔

ڈرائیور پہلا، دوسرا، تیسرا اور پھر ٹاپ گیئر لگاتا ہے۔

اونچی نیچی سڑک پر بس ہوا سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ ڈرائیور کا دل خوشی سے کھل اٹھتا ہے۔ نارو اس کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ کر

اسے بیک مرر میں سے پیچھے کی سڑک اور ٹریفک کو دیکھ کر اپنا راستہ متعین کرنے کی بجائے بس میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ڈرائیور بیک مرر سیٹ کرتا ہے۔

اسی لمحے چلتی بس میں قہقہے مارتی ہوئی سوار ہوتی ہے۔ ناردا سے ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ سیٹوں کے درمیان پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی ہے۔

ایک مسافر اور کنڈکٹر کا پچاس پیسے زیادہ کرایہ مانگنے پر جھگڑا ہوتا ہے۔ ہوئی ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی ہے۔

نارد ڈرائیور کی بغل میں ہاتھ ڈال کر گدگدی کرتا ہے۔

ڈرائیور ہنستا ہے۔ پھر دلوں میں گدگدی پیدا کرنے والے گانوں کی دوسری ٹیپ لگاتا ہے اور شیشے میں نظر آنے والی اس نوجوان لڑکی کو آنکھ مارتا ہے جو آنکھوں میں امنڈتے آنسوؤں کو اپنی آہوں میں جذب کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہوسٹل میں اسے اپنے ابا کے مرنے کا ٹیلی فون کے ذریعے پیغام ملا تھا اور وہ جلد از جلد گھر پہنچ کر اس کا منہ دیکھنا چاہتی ہے' غریب کو کیا خبر کہ اس سے پہلے ڈرائیور بس کو کہاں پہنچا دے گا؟

بس کے میٹر کی سوئیاں رفتار کی سیڑھیاں چڑھتی ہیں۔

ہوا میں سے سینے پر دوہتڑ مارتی ماؤں اور بلند آواز میں بین کرتی بہنوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

ہوئی اٹھ کر ایک کھڑکی کے پاس جاتی اور شیشے چڑھاتی ہے۔ نارد ڈرائیور کو بیک مرر میں سے باپ کے جنازے پر پہنچنے والی لڑکی کو دیکھنے کا اشارہ کرتا اور بغل میں بیٹھ کر ہنستا ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے سفر کم ہوتا جا رہا ہے۔ اپنے انجام سے بے خبر مسافر سفر کم ہونے پر خوش ہوتے ہیں۔ بس ہر لمحے اس مقام کے اور قریب ہوتی جا رہی ہے جہاں کل اس کی بیتابی سے انتظار کر رہی ہے۔

ایکسلیٹر پر ڈرائیور کے پاؤں کا بوجھ بڑھتا ہے۔

باپ کے جنازے پر پہنچنے والی لڑکی سر اٹھاتی ہے ڈرائیور اسے پھر آنکھ مارتا ہے۔ نارد بکرے بلاتا اور ہوئی سیٹوں کے درمیان لڈی مارتی ہے۔

مسافروں میں سے کوئی بس تیز چلانے اور ڈرائیور کے بیک مرر میں دیکھتے رہنے پر اعتراض نہیں کرتا۔

ہوئی اور نارد تالیاں بجاتے اس پل کی جانب دیکھتے ہیں جہاں کالے کپڑے پہنے کل منتظر کھڑی ہے۔

ڈرائیور ابھی تک بیک مرر میں دیکھ رہا ہے

اور یوں میرے سر سے اس کہانی کا بوجھ اتر گیا ہے۔

لیکن ٹھہریئے!

میں آپ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں۔

بس ابھی تک چلی جارہی ہے۔ آج حادثے کا شکار نہیں ہوئی اور منزل پر پہنچ جاتی ہے لیکن آپ جانتے ہیں ایسا ہو تو سکتا ہے نا.....!

